قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا بہتر واں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جون 2015ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

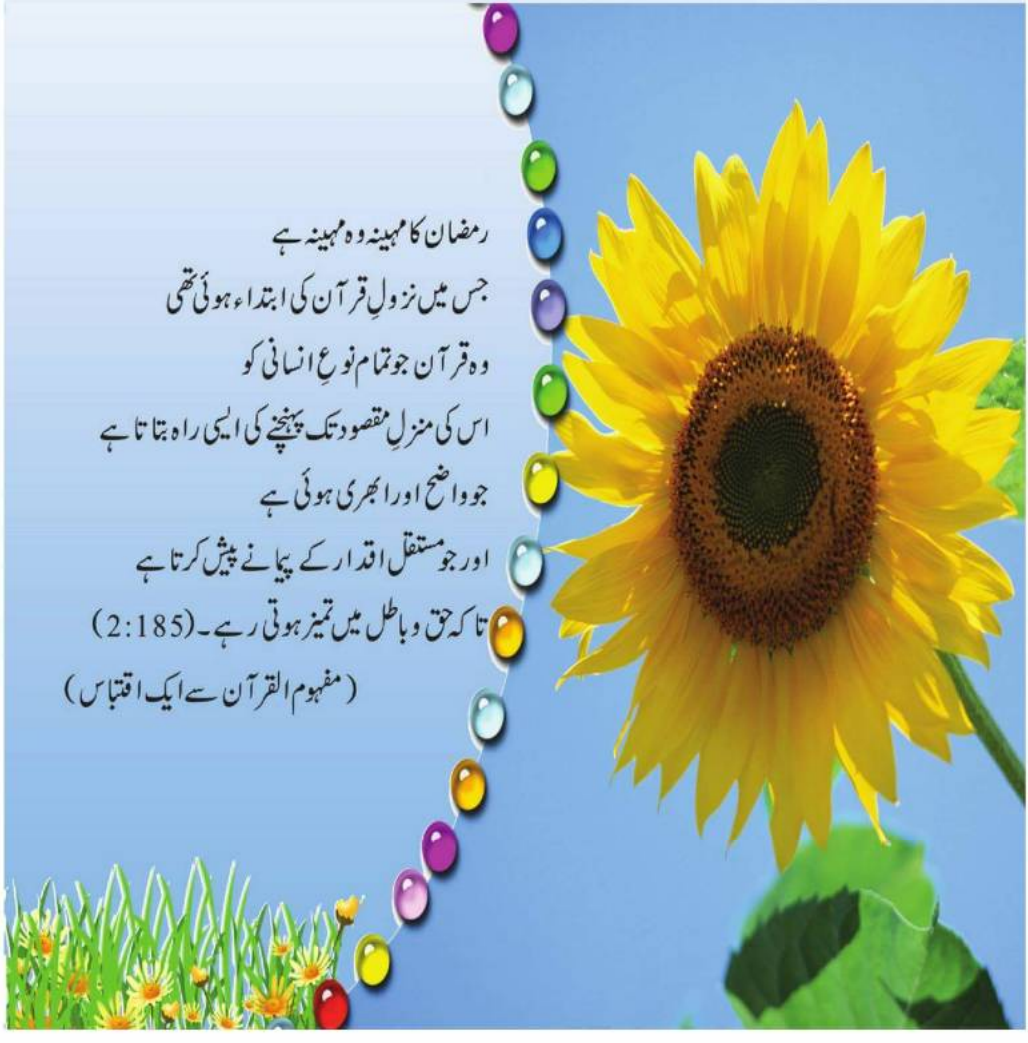

رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے
جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی
وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو
اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے
جو واضح اور ابھری ہوئی ہے
اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے
تاکہ حق و باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ (2:185)
(مفہوم القرآن سے ایک اقتباس)

جلد 68 شمارہ نمبر 06 جون 2015ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: قوم کو قرآن سے روشناس کرایا جائے	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اجتہاد (فقہ) قسط چہارم	ملک منظور حسین لیل	6
روزہ کا مقصود متقی	ادارہ	16
روحِ انسانی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے	خواجہ ازہر عباس	22
لغات القرآن: ن س خ	ادارہ	28
دو اسلام	ماخوذ روزنامہ ایکسپریس	33
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	43

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰت) – Durus-al-Qur'an By G.A.Parwez
Parah 30: Chapter 7 Translated by: Dr. Mansoor Alam 51

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان)
فون: 042-35714546
E-mail: idarati@gmail.com

ناشر و چیئرمین
محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی
محمد سلیم اختر

قانونی مشیر
ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

زرِ تعاون 40 روپے فی پرچہ
پاکستان -/450 روپے سالانہ
بیرون ملک 2500 روپے سالانہ

بینک اکاؤنٹ نمبر
3082-7 نیشنل بینک آف پاکستان، مین مارکیٹ گلبرگ
برانچ کوڈ (0465)۔ لاہور

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد قرار آمد
کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیل نغمہ پردازاں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر وبیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیث خواجہؐ بدر وحنین آور
تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نم ناک می گردد
ببازارِ محبت نقد ما کامل عیار آمد
سر خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملت ما سازگار آمد
''بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحِ دیگر اندازیم''

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

لمعات

قوم کو قرآن سے روشناس کرایا جائے

جب کسی معاشرہ میں ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے اور کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہے تو اس کا لازمی نتیجہ مایوسی ہوتا ہے۔ مایوسی یعنی Frustration میں کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کو سدھارنے کے لیے کیا کیا جائے۔ پوری قوم کی قوت، ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دینے میں مصروف رہتی ہے۔ لیڈر، عوام کو کوستے ہیں۔ تو عوام اپنے لیڈروں کو یہ کہہ کر مطعون کرتے ہیں کہ وہ بالکل نکمے اور بے ایمان ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ قرآن کریم یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر نسل (زمانہ) کے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے والوں نے جو جرائم کیے، ہمیں ان کی سزا مل رہی ہے۔ ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ یہ عذر تراشیاں بے معنی ہیں۔ اگر تم سے پہلوں نے غلطیاں کی تھیں تو تم خود ان کا ازالہ کیوں نہیں کر لیتے۔ خاص کر تم میں سے، وہ جو مسانید اقتدار پر قابض ہیں۔ انہیں ایسا کہنے کی بجائے، اپنی قوتِ اقتدار کو بروئے کار لا کر اصلاح معاشرہ کرنے میں کون سی چیز مانع ہے۔ اگر تمہارے اگلوں نے جرائم کیے تھے تو تم بھی تو، سب کچھ سمجھتے بوجھتے اور ان کی اصلاح کرنے کی قوت رکھتے ہوئے، غلط معاشرہ کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے کے مجرم ہو۔

آیئے اب آپ کے حالات پر ایک نظر ڈالیں۔ پاکستان ایک متاعِ گراں بہا ہے جو ہمیں فطرت کی طرف سے بطور نعمت ملی اور جس کے حصول میں، بانیٔ پاکستان علیہ الرحمۃ اللہ کا خونِ جگر بھی شامل ہے۔ لیکن ہم نے اس کی سخت ناقدری کی اور خدا سے کئے ہوئے اپنے وعدوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے، اس کے اندر قوانین خداوندی کے نفاذ اور ان کے اتباع سے گریز کی راہیں ڈھونڈھتے رہے اور اس طرح ہم نے اپنے لیے وہ جہنم پیدا کر لیا جس میں آج ہم سب جھلس رہے ہیں۔ اس عذاب میں گرفتار ہم اپنے سے پہلی قوموں کی طرح کبھی گذر جانے والوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور کبھی آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوتے ہیں اور یہ کچھ کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ ہم اسی ادھیڑ بن میں مگن رہتے ہیں اور اس جہنم کے شعلے دن بدن بلند ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ اس صورتحال کا بنیادی سبب قانونِ خداوندی سے رُوگردانی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے؟ اگر آپ بنگاہِ تعمق اپنے معاشرہ کے حالات پر غور

کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں کوئی ایسا خاص پرزہ نہیں جس کے بدل دینے سے اصلاحِ احوال ہوجائے۔ یہ خرابی اس پورے کے پورے نظام میں ہے جو غیر قرآنی بنیاد پر متشکل ہے۔ مفاد پرست گروہ، اپنی جگہوں پر، دن رات ایسی سازشوں میں مصروف رہتے ہیں کہ مستقلاً ایسے حالات پیدا کرتے جائیں جن میں عوام کا، قوانین الٰہی کے اتباع کا جذبہ پنپنے نہ پائے اور موجودہ باطل نظام قائم رہے تاکہ وہ محنت کرنے والوں کا اسی طرح استحصال کرتے رہیں لیکن خدا کا قانونِ مکافات ہر فرعون کے لیے ایک صاحبِ ضربِ کلیم پیدا کر دیتا ہے۔ دریں حالات یہ کرنا ہوگا کہ اپنے غیر قرآنی نظام کی جگہ خدا کے عطا فرمودہ، قرآن کریم کی دفعتین کے اندر محفوظ الدین کو نافذ اور متمکن کیا جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے تو اس کے لیے، سب سے پہلے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس کے لیے ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ۔۔۔۔۔۔۔ ہمیں اسوۂ رسول اللہ ﷺ پر عمل کرنا ہوگا اور وہ یہی ہے کہ مسلسل تعلیم سے عوام کو قرآن کے عطا کردہ فلسفۂ حیات اور اس پر مبنی نظامِ ربوبیت سے اس طرح روشناس کرایا جائے کہ اس کا قیام، ہر فرد امت کے دل کی آرزو بن کر ابھرے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا، اصلاحِ احوال کی کوئی دوسری صورت نہیں:۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرض کہن کا چارہ

* * *

ضرورت ہائے رشتہ

ایک بیٹی عمر 24 سال، تعلیم ڈاکٹر آف فارمیسی، گولڈ میڈلسٹ، ایم فل میں زیر تعلیم، فارماسوٹیکل انڈسٹری میں آن جاب، قرآنی گھرانا سے تعلق ہے، کے لیے ڈاکٹر، انجینئر یا بیرون ملک مناسب وموزوں رشتہ درکار ہے۔ برائے رابطہ: 0300-6674670

Email: muhammadimranmian@yahoo.com

بیٹی عمر 21 سال ہے۔ تعلیم بی اے، بی ایڈ، ایم ایڈ ہے۔ رہائش ملتان میں ہے قرآنی فکر سے تعلق ہے۔ مناسب وموزوں رشتہ درکار ہے۔ برائے رابطہ: 0306-7327901

بیٹی جس کی تعلیم ایم اے اور عمر 29 سال ہے، کے لیے قرآنی گھرانے کے برسرروزگار نوجوان کا رشتہ درکار ہے

برائے رابطہ: 0306-2399466

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

قسط چہارم

پرویز صاحب کا نظریۂ اجتہاد (فقہ)

(قانون سازی)

قانون سازی کا اہم ترین کام، ہر دور میں، بدلتے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر، قرآن کریم کی حدود میں رہتے ہوئے، پوری امت کی مشاورت سے جاری رہے گا۔ مشاورت کا طریقہ کار بھی پوری امت کی مشاورت سے وضع اور طے کیا جائے گا۔ انفرادی یا اجتماعی (گروہی) تدبر و تحقیق کو صرف تجاویز کی حیثیت حاصل ہوگی۔ قانون سازی کا اختیار کسی ایک فرد، گروہ، جماعت پارٹی یا فرقہ کو حاصل نہیں، یہ پوری امت (یعنی اسلامی مملکت) کا کام ہے۔

علامہ اقبالؒ کا تصورِ اسلام:۔ علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی اس صورتِ حال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بنیادی وجہ، مسلمانوں کی کسی مملکت کا بھی اسلامی نہ ہونا ہے۔ اگر کسی ایسی مملکت کا قیام عمل میں آجائے جس میں صحیح قرآنی نظام نافذ ہو، تو اسلام از سرِ نو زندہ ہوسکتا ہے۔ ان کے نزدیک، اُس اسلام کا تصور کیا تھا جسے وہ اس طرح زندہ کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انہوں نے اپنے خطبات، تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں تفصیل سے بحث کی ہے، جس کا عنوان ہے۔ ''اسلامی قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء''۔ اس میں انہوں نے کہا ہے:۔ ''اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔۔ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ

ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصول تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا، دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع قطع اور ترکیب میں کون سا اصول حرکت کارفرما ہے، یہ اصول وہی ہے، جسے اجتہاد کہتے ہیں۔''

اقبالؒ اور قانون سازی:۔ طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۶ء ص۔ ۱۷۔۱۶:۔ پرویز صاحب علامہ اقبالؒ کے خطبہ کا مندرجہ بالا اقتباس پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:۔ ''انہوں (اقبالؒ) نے اس حقیقت کو، اس خطبہ کی آخری سطور میں ان الفاظ میں دہرایا:۔ 'زندگی کی روحانی بنیاد، مسلمانوں کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامل ، اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بناء پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔' اس اصول کو بیان کرنے کے بعد انہوں (اقبالؒ) نے کہا کہ اسلامی ضابطہ قوانین میں غیر متبدل صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس کی روشنی میں جس قدر قوانین وضوابط مرتب کئے جائیں گے، ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے، اور یہ تبدیلی اسلامی مملکت کرے گی۔ انہوں نے اس نقطہ کی وضاحت کرتے ہوئے اُسی خطبہ میں کہا:۔ 'آیئے! اب ایک نظر اُن اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس، ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہنمائی سے ہمارے قدیم فقہاء نے، قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ:۔ 'رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔' لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں ۔لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے (پچھلے صفحات میں) ان اسباب وعلل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوونما ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس

قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو قطعی، کامل، مختتم اور سہو وخطا سے مبرّا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل، میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتی ہے لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔''

صحابہؓ کے فیصلوں کی حیثیت:۔ طلوعِ اسلام جون ۱۹۸۳ء۔ ص۔ ۳۱:۔ علامہ پرویز علامہ اقبالؒ کے نظریات بابت قانون سازی کے بارے میں اقبالؒ کے چھٹے خطبہ کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں اقبالؒ نے کہا ہے کہ:۔ ''کسی معاملہ میں صحابہؓ نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا، تو اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی پابند رہیں گی؟۔ امام شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور مختلف مذاہبِ فقہ کے ائمہ کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں ضروری ہے کہ ان امور میں، جن کا تعلق واقعات (FACTS) سے ہے اور اُن میں، جن کا تعلق قانون سے ہے، فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن امور کا تعلق (عہدِ رسالت یا زمانہء صحابہؓ کے) واقعات وحوادث سے ہے، ان میں صحابہؓ کا فیصلہ قولِ فیصل ہوگا۔ اس لئے کہ اس زمانے کے واقعات کا علم صحابہؓ سے زیادہ اور کسی کو نہیں ہوسکتا تھا۔ مثال کے طور پر اس واقعہ کو لیجئے جس میں یہ سوال اٹھا کہ کیا قرآن کی وہ سورتیں جنہیں معوذتین کہا جاتا ہے، قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں؟۔ اور صحابہؓ نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن کی حیثیت قانونی ہے، ان کی بابت میری ناچیز رائے یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس میں سوال (قرآن کے کسی اصولی حکم کی) تعبیر کا ہے۔ چنانچہ امام کرخی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔ ''سنتِ صحابہؓ صرف ان معاملات میں واجب الاتباع ہے جن کا فیصلہ قیاس سے نہیں کیا جا سکتا۔ جن معاملات کا فیصلہ (اجتہاد و) قیاس سے کیا جاسکتا ہے، ان میں اُن کی سنت کی تقلید لازم نہیں۔''

ماضی کا جھوٹا احترام:۔ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۷۷ء۔ ص۔ ۲۸:۔ پرویز صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:۔ ''وہ (اقبالؒ) اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن وہ کہتے ہیں کہ:۔ 'قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہوسکتا، جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے کہ:۔ تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں، ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔' تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ اور اس نکتہ کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔ 'اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر

قیود جس طرح جی چاہے وضع کئے جاسکتے ہیں۔ یہ سب قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے وضع کئے جاتے ہیں۔''

طلوعِ اسلام۔ مئی ۱۹۷۸ء۔ صفحہ نمبر ۳۱۔ ۳۰:۔ قانون سازی کے معاملہ میں پرویز صاحب علّامہ اقبال کا حوالہ دیتے ہیں کہ:۔ ''علّامہ اقبالؒ کے نزدیک اسلامی مملکت میں قانون سازی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ابدی اور غیر متبدل قرآنی احکام واصول وحدود ہیں۔ ان حدود کے اندر جو فیصلے ماضی میں کئے گئے تھے، یا جو بعد کی اسلامی مملکت کرے، ان میں تغیر وتبدل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن انہیں اس کا بھی بخوبی احساس تھا کہ ایسا کرنے کے لئے بڑی جراءت وبسالت کی ضرورت ہوگی۔ اس باب میں وہ کہتے ہیں کہ:۔ ''وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اس کے (ترکی کے) اور جو، زود، یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے، یہ ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟۔

روحِ عمریؓ:۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جراءت نصیب ہوئی کہ:۔ حسبنا کتاب اللہ۔ ''ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔'' وہ (اقبالؒ) اپنے اس خطبہ کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتے ہیں:۔ ''اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بناء پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے۔ پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیائے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھا دے جو اسلام کی اصل وغائیت ہے لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔''

قوانین شریعت کی تدوین:۔ طلوعِ اسلام نومبر ۱۹۷۰ء۔ ص۔ ۲۲:۔ ''تشکیل پاکستان کے بعد، مذہب پرست طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ چونکہ اس مملکت کو اسلامی مملکت بنانا مقصود ہے اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہونا چاہئیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آئین پاکستان میں یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا جو ''کتاب وسنت'' کے خلاف ہو۔ یہ مطالبہ اس قدر مقدس، مسلمہ اور معصوم سا تھا کہ کسی کے حیطہء تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ کسی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی۔ لیکن طلوعِ اسلام نے اس کی بھی مخالفت کی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اسلامی ضابطہء قوانین اسے کہتے ہیں جسے تمام مسلمان اسلامی تسلیم کریں اور اس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو۔ ''کتاب وسنت'' کی رو سے کوئی ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں کیا جاسکتا جو پاکستان میں بسنے والے تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ جب ایسا ہونا ناممکنات میں سے ہے تو اپنے آپ کو، یا اہل پاکستان کو اس فریب میں رکھنے سے کیا حاصل؟۔ اور اگر کسی ایک فرقہ کے ضابطہء قوانین کو تمام فرقوں پر زبردستی ٹھونسا گیا تو اس کے

دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسان سمجھنے کی بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس ''افتراء'' کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا، یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں: 'اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں، تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کو سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)۔' ان تصریحات سے واضح ہے کہ علامہ اقبالؒ کے نزدیک، مروجہ فقہ (خواہ وہ کسی فرقہ کی فقہ ہو) ناقابل تغیر نہیں۔ اس میں قرآن کی روشنی میں، موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق، تبدیلیاں ازبس ضروری اور ناگزیر ہیں۔ لیکن ایسا کہتے وقت وہ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ: 'بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی۔' لیکن انہوں نے کہا کہ:۔ ''با ایں ہمہ، میں مسئلہء زیرِ نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔ سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قرنِ اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا۔''

طلوعِ اسلام دسمبر ۱۹۷۹ء۔ صفحہ نمبر ۸-۷:۔ ''تصورِ اقبالؒ کی رو سے اسلامی مملکت کے حدود و قیود ذیل کی سطور میں ملاحظہ فرمائیے۔ حضرات انبیاء کرام کو خدا کی طرف سے ایک ضابطہء قوانین و آئین عطا ہوتا تھا۔ جو قوم اس ضابطہ کی صداقت کو تسلیم کر لیتی تھی اس کا فریضہ ہوتا تھا کہ وہ اسے عملاً نافذ کرے۔ چونکہ یہ پوری قوم ایک ضابطہ کے تابع زندگی بسر کرتی تھی اس لئے اس میں کسی قسم کے اختلاف اور تفرقہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔۔۔ رسول کے چلے جانے کے بعد، وہ قوم اس ضابطہ میں آمیزشیں کر دیتی اور اس طرح ان میں اختلافات نمودار ہو جاتے۔ اس طرح وہ ''دین''، ''مذہب'' بن جاتا تھا۔ یہ جو دنیا میں مختلف مذاہب پائے جاتے ہیں، یوں سمجھئے کہ یہ ''دین'' میں پیدا شدہ مختلف فرقے ہیں، کیونکہ ''دین'' تو شروع سے آخر تک ایک ہی تھا۔ ''دین'' کی اطاعت کرنے والوں میں فرقے پیدا ہو ہی نہیں سکتے۔۔۔ یہ ''دین'' آخری مرتبہ، مکمل اور غیر متبدل شکل میں نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے ملا۔ جن سعادت مند افراد نے اس کی صداقت کو تسلیم کر لیا وہ ایک قوم (یا اُمت) بن گئے۔ اس اُمت نے، اس ''دین'' کو عملاً نافذ کرنے کے لئے ایک مملکت کی تشکیل کی جس کا ضابطہء آئین قرآن کریم تھا۔ اس مملکت کی مرکزی اتھارٹی، اُمت کے مشورہ سے، اس ''دین'' پر عمل

پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرتی اور انہیں قوانینِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کرتی۔ان کا اطلاق تمام اُمت پر یکساں طور پر ہوتا۔ظاہر ہے کہ اس نظام میں،اُمت میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔مختلف فرقوں کے معنی تو یہ تھے کہ مختلف گروہ،مملکت کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کی بجائے،اپنے اپنے وضع کردہ قوانین کی اطاعت کرتے۔ایک مملکت کے اندر رہتے ہوئے اس قسم کا طرزِ عمل تو مملکت سے بغاوت کے مرادف ہوتا ہے۔یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے(۳۰/۳۱)۔یعنی ایک اتھارٹی(حکومتِ قرآنی) کی اطاعت کرنے کی بجائے،مختلف اتھارٹیز کی اطاعت کرنا۔رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا کہ جو لوگ فرقے پیدا کرلیں تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا(۶/۱۶۰)۔یعنی جو مملکتِ اسلامیہ کی مرکزی حیثیت ہی کو تسلیم نہ کریں،ان کا اس مرکز سے کیا تعلق؟۔وہ تو اس کے باغی قرار پاتے ہیں۔چونکہ مرکزِ ملّت کے فیصلے قرآن کے مطابق ہوتے تھے،اور فرقوں میں فیصلے اپنی اپنی فقہ کے مطابق ہوتے ہیں،اس لئے کہہ دیا کہ جو لوگ۔۔ماانزل اللہ۔۔(قرآن مجید) کی رو سے فیصلے نہیں کرتے،اُنہیں مومن نہیں کہا جاسکتا(۵/۴۴)۔

مرکزی اتھارٹی کا خاتمہ:۔ ہمارے ساتھ ہوا یہ ہے کہ اُمت کی مرکزی اتھارٹی(حکومتِ خداوندی یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے باقی نہ رہنے سے ''دین''،''مذہب'' میں تبدیل ہو چکا ہے،اس لئے اس میں مختلف فرقے پیدا ہو چکے ہیں۔اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ان فرقوں کو باقی رکھتے ہوئے اسلامی نظام(یعنی دینِ خداوندی) قائم ہوسکتا ہے تو وہ یا تو ''دین'' اور ''مذہب'' میں فرق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور یا پھر اُمت کو فریب میں مبتلا رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔فرقوں کی موجودگی میں ''دین'' کا نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا۔''دین'' کا نظام قائم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے،اور وہ یہ کہ ایک ایسی مملکت کا قیام عمل میں آئے جو قرآنی اصولوں کو مملکت کا آئین قرار دے۔اُمت کے مشورہ سے ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طور طریق وضع کرے۔انہیں قوانینِ حکومت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں نافذ کرے۔اس میں نہ اِس فرقے یا اُس فرقے کی کوئی تمیز ہو اور نہ ہی پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق۔۔اس طرح ایک خدا۔۔ایک ضابطہء قوانین اور ایک اُمت کی تشکیل سے،دین کا نظام قائم ہوگا۔اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو احیاء اسلام کی ہر کوشش رائیگاں جائے گی۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:۔''یہ وہ حدود ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں،اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے،ملّتِ اسلامیہ اپنی مملکت کے لئے قوانین وضوابط وضع کرتی ہے جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کوئی مملکت وجود میں نہیں آسکتی،اور اگر وجود میں آجائے تو مستحکم نہیں رہ سکتی،جب تک اس میں ایک(واحد) ضابطہء قوانین نافذ نہ ہو۔جس مملکت میں مختلف گروہ اپنے لئے الگ الگ قوانین وضوابط وضع کرلیں،اس میں انارکی پھیل جاتی ہے۔سیکولر اسٹیٹ میں قانون سازی کا مسئلہ آسان ہوتا ہے۔اس میں مختلف مذہبی گروہوں کو ان کے اپنے شخصی قوانین پر عمل پیرا ہونے کی آزادی دے دی جاتی ہے اور پبلک لاز کا ضابطہ،بلاتمیز مذاہب آزادانہ وضع کرلیا جاتا ہے جس کا اطلاق تمام باشندوں پر یکساں ہوتا ہے۔لیکن اسلام میں نہ تو پرسنل لاز اور پبلک لاز میں تفریق ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے پبلک لاز بلاحدود

نتائج اس قدر خطرناک ہوں گے جس سے خود مملکت کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسلامی مملکت کے لئے ضابطہ قوانین مرتب کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مختلف فرقے، اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر، قرآن کریم کو قانون کی سند اور حجت تسلیم کریں اور حالاتِ حاضرہ کو سامنے رکھتے ہوئے، ایک جدید فقہ مرتب کریں۔ اگر مختلف فرقے ایسا کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو پھر بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو فریب میں رکھا جائے، اس کا اعتراف کر لیا جائے کہ مملکت میں اسلامی قوانین نافذ کرنا ممکن نہیں۔''

پاکستان میں قانون سازی:۔ طلوعِ اسلام مئی ۱۹۸۵ء۔ص۔۵۰:۔''اب ہم سورہء حدید کی (متعلقہ) آیت (۲۵/۵۷) کے پہلے حصے کی طرف آتے ہیں۔ یعنی کتاب (ضابطہء قوانین)۔ علامہ اقبال نے جب پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو یہ حقیقت ان کے پیش نظر تھی کہ اس مملکت میں سب سے اہم سوال قانون سازی کا ہوگا۔ بظاہر یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کا مسئلہ اس قدر مشکل ہو! جس امت کے پاس خدا کی کتاب اپنی حقیقی اور غیر محرف شکل میں موجود ہو، اس کے لئے اپنی (اسلامی) مملکت میں قوانین مرتب کرنے میں کون سی دشواری پیش آسکتی ہے! لیکن جاننے والے جانتے ہیں۔۔۔ اور پاکستان کی تیس سالہ (اور اب ساٹھ سال سے زیادہ۔ مئولف) تاریخ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ بحالاتِ موجودہ، اسلامی مملکت کے لئے قانون سازی کا مسئلہ دشوار ترین بلکہ لاینحل ہے۔ یہ اس لئے کہ امت مختلف فرقوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر فرقہ کا ضابطہء قوانینِ شریعت اپنا اپنا اور الگ الگ ہے، اور کوئی فرقہ، اپنی فقہ کو چھوڑنا تو ایک طرف، اس میں ذرا سی ردوبدل کے لئے بھی تیار نہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی واضح اور مسلمہ ہے کہ ایک مملکت اسی صورت میں مملکت بن سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطہء قوانین نافذ ہو جس کا اطلاق تمام افرادِ مملکت پر یکساں ہو۔ سیکولر حکومتوں نے اس کا حل یہ تجویز اور اختیار کیا کہ مختلف فرقوں کو اس کی اجازت دے دی کہ وہ شخصی معاملات کے لئے اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور پبلک لاز (مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) حکومت خود مرتب کرے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کو کبھی اسلامی نہیں کہا جا سکتا۔ اوّل اس لئے کہ قرآن کی رو سے، پرسنل لاز اور پبلک لاز میں کسی قسم کی تفریق اور تخصیص نہیں کی جا سکتی۔ اس کے نزدیک انسانی زندگی ایک غیر منقسم وحدت ہے جسے پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس لئے کہ پرائیویٹ سیکٹر ہو یا پبلک، اسلامی حکومت اس کی مجاز ہی نہیں کہ وہ بلا حدود و قیود (عام اصطلاح میں، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر) قوانین مرتب کر سکے۔ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے ہی قوانین مرتب کر سکتی ہے۔ علامہ اقبال نے اس اہم ترین (اور بظاہر مشکل ترین) مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ اسلامی مملکت میں قوانین کی بنیاد خدا کی کتاب، قرآن مجید قرار پاتی ہے۔ جو قوانین اس بنیاد پر مرتب ہوں گے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔ ان میں نہ پرسنل اور پبلک لاز کی تفریق ہوگی، نہ فرقوں کی تخصیص۔ ان کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوگا۔''

علماء کے بائیس نکات:۔ طلوعِ اسلام اپریل ۱۹۸۱ء۔ص۔۲:۔''عام پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ یہاں تیس سال میں کسی حکومت نے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر کبھی پاکستان کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے حالات سازگار ہوئے تو ہم

بتائیں گے کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ کیوں نہ ہوئے اور یہ کتنی بڑی سازش تھی جس کے نتیجہ میں یہ مملکت قرآنی نہ بن سکی۔۔۔اس وقت صرف یہ سمجھ لینا کافی ہوگا کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ سامنے آیا کہ جس مملکت میں مسلمانوں کے مختلف فرقے بستے ہوں وہاں کون سے اسلامی قوانین نافذ کئے جائیں؟۔۔اس سوال کا جواب مہیا کرنے کے لئے، ۱۹۵۱ء میں، مختلف فرقوں کے نمائندہ (۳۱) علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ جس میں متفقہ طور پر یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ ملک کے لئے ضابطہء قوانین ''کتاب وسنت'' کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اس ریزولیوشن کے بعد دھوم مچادی گئی کہ علماء حضرات نے اتمامِ حجت کر دیا ہے۔ اب اگر اسلامی قوانین نافذ نہیں کئے جاتے تو اس سے اربابِ حکومت کی بدنیتی واضح ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ ریزولیوشن درحقیقت بہت بڑا سراب ہے۔ یہ حضرات جانتے ہیں کہ کتاب وسنت کے مطابق کوئی ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں کیا جا سکتا جسے تمام فرقے (حتیٰ کہ یہی علماء جنہوں نے اس ریزولیوشن پر دستخط کئے ہیں) متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔۔۔اس دوران میں ایک دفعہ (مرحوم) ایوب خان نے یہ پیشکش بھی کر دی کہ اگر علماء حضرات ایک متفقہ علیہ ضابطہء قوانین مرتب کر دیں تو وہ اس پر آنکھ بند کر کے دستخط کر دیں گے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ یہ شخص علماء کے اختلاف سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے!۔۔وقت گزرتا گیا اور ان حضرات کی طرف سے ہر حکومت کے خلاف یہ پراپیگنڈہ جاری رہا کہ یہ لوگ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرنا چاہتے۔ اور اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام کے خلاف انکارِ حدیث کا خودساختہ الزام بھی۔ تا آنکہ ۱۹۷۰ء میں (مرحوم) مودودی صاحب کو اس کا اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ کتاب وسنت کی رو سے واقعی کوئی ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ علماء حضرات میں سے کسی نے نہ ان کے اس اعلان کی تردید کی، نہ انہیں منکرِ حدیث قرار دیا۔۔۔مرحوم سے پوچھا گیا کہ پھر، مملکت میں اسلامی قوانین کس طرح نافذ ہوں گے، تو انہوں نے کہا کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے (حالانکہ وہ خود فقہ حنفی کے سخت خلاف تھے)۔ گویا کتاب وسنت کی رو سے مرتب کردہ ضابطہء قوانین کو تو تمام فرقے اسلامی تسلیم نہیں کریں گے۔ فقہ حنفی کو تمام فرقے اسلامی تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کر لیں گے!۔۔۔۔کسی نے اُن سے یہ نہ پوچھا کہ جب آپ جانتے تھے کہ کتاب وسنت کے مطابق ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو آپ نے:۔۔۔۔۔۔(۱)۔ ۱۹۵۱ء والے ریزولیوشن پر دستخط کیوں ثبت فرمائے تھے۔ (۲)۔ بیس سال تک ہر حکومت کے خلاف یہ پروپیگنڈہ کیوں کرتے رہے کہ وہ اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتے۔ اور (۳)۔ اب جو آپ مشورہ دے رہے ہیں کہ ملک میں ایک فرقہ (حنفی) کی فقہ نافذ کر دی جائے تو کیا یہ تمام فرقوں کے لئے قابلِ قبول ہوگی؟۔ کسی نے ان سے اتنا نہ پوچھا!۔ اصل یہ ہے کہ ہماری قوم اسلام کی طرف سے کچھ ایسی دل برداشتہ ہو چکی ہے کہ وہ مذہب سے متعلق امور کو (Seriously) لیتی ہی نہیں۔ حالانکہ یہ وہ گوشہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے لئے سانس لینے سے بھی زیادہ اہم ہے۔

فقہ حنفی:۔ سابقہ حکومتیں جانتی تھیں کہ جس ملک میں مختلف فرقوں کے لوگ آباد ہوں وہاں کسی ایک فقہ کو قانونِ مملکت کی حیثیت سے نافذ کر دینے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس لئے انہوں نے اس مشورہ یا تجویز کو قابلِ پذیرائی نہ سمجھا۔ موجودہ (ضیاء) حکومت نے البتہ اس پر عمل

درآمد کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ جو آپ ملک میں اسلامی نظام، اسلامی قوانین، اسلامی شریعت وغیرہ کے چرچے سن رہے ہیں، اس سے درحقیقت مراد فقہ حنفی کا اجراء ہے۔ اور اس کے عملی نتائج ابھی سے سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں پہلے چند قوانین ''حدود'' (سزاؤں) سے متعلق نافذ کئے گئے جو نا قابل عمل ثابت ہوئے۔ زکواۃ کے متعلق احکام نافذ کئے گئے تو ان کے خلاف اس شدت سے احتجاج ہوا کہ حکومت کو اس کی اجازت دینا پڑی کہ ہر شخص اپنی فقہ کے مطابق زکواۃ ادا کر سکتا ہے۔ یعنی یہ بھی مملکت کا قانون نہ بن سکا۔''

شخصی قوانین:۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۸ء۔ص۔ ۵۳:۔ ''آپ سوچئے کہ ان حضرات کا یہ مطالبہ کہ مملکت کے قوانین ''قرآن وسنت'' کے مطابق مرتب کر دیئے جائیں، عملاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟۔ ان میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ ''سنت'' کے معاملہ میں ان کے باہمی اختلافات بنیادی ہیں، اور جس بات کو ایک فرقہ سنت قرار دیتا ہے، دوسرا اسے سنت سمجھتا ہی نہیں۔ یعنی ان کا اس بنیاد پر بھی اتفاق نہیں کہ ''سنت'' کہتے کسے ہیں، اور وہ کس کتاب میں ہے؟۔ ان حضرات کو اس حقیقت کا خود احساس ہے۔ اس کا انہوں نے حل یہ سوچا ہے کہ آئین میں یہ شق رکھ دی جائے کہ شخصی قوانین (Personal Laws) میں قرآن وسنت کی تعبیر وہی لی جائے جو متعلقہ فرقے کے نزدیک قابل قبول ہو۔ اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ شخصی قانون کی صورت میں ہر فرقہ کی الگ الگ تعبیر قابل قبول ہو گی تو ملکی قانون کا مسئلہ کس طرح حل ہو گا؟۔ اس لئے کہ کتاب وسنت کی مطابقت کی شرط ملکی قوانین پر اسی طرح عائد ہو گی جس طرح شخصی قانون پر۔ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فلاں ملکی قانون مطابق سنت ہے یا نہیں، جبکہ مملکت کے سامنے سنت کی کوئی جامع تعریف یا کتاب ہی نہیں ہو گی۔ ان حضرات نے یہ مطالبہ پیش کر کے کہ شخصی قوانین میں ہر فرقہ کی ''کتاب وسنت'' کی الگ الگ تعبیر تسلیم کر لی جائے، اس امر کا اعلان کر دیا ہے کہ کتاب وسنت سے شخصی قوانین بھی ایسے نہیں بنائے جا سکتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوں۔ اس سے لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کتاب وسنت سے شخصی قوانین بھی متفق علیہ نہیں بن سکتے (یعنی کتاب وسنت کی رو سے نکاح اور طلاق وغیرہ سے متعلق قوانین بھی ایسے نہیں بن سکتے جو سب کے نزدیک متفق ہوں) تو اسی کتاب و سنت کی رو سے متفق علیہ ملکی قوانین کس طرح بن سکیں گے؟۔ اس کا جواب ان میں سے کوئی نہیں دیتا لیکن اس کے باوجود اس مطالبہ کو ہر ایک دہرائے چلا جا رہا ہے۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھا ہے کہ:۔ ''یہ آئین کا بنیادی مسئلہ ہے، جس کا حل آپ کو ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیئے۔ اگر آپ (۱)۔ سنتِ رسول اللہ ﷺ کی ایسی تعریف (Definition) مرتب کر دیتے جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہوتی۔ اور (۲)۔ کسی ایسی کتاب کی نشان دہی کر دیتے جس میں پوری کی پوری سنتِ رسول اللہ ﷺ درج ہوتی اور اس کتاب کا متن سب کے نزدیک، قرآن کے متن کی طرح، متفق علیہ اور تنقید سے بالا ہوتا، تو آپ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے ایک متفق علیہ مطالبہ پیش کر دیا ہے۔ لیکن جب حقیقت یہ ہو کہ مطالبہ پیش کرنے والے اس خشتِ اول ہی پر متفق نہ ہوں کہ ''سنت'' کسے کہتے ہیں اور کہاں سے ملے گی تو اس مطالبہ کو متفق علیہ کہنا خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے۔'' پھر صفحہ نمبر ۶۶ پر لکھا ہے کہ:۔ ''اس باب میں سوال یہ ہے کہ کیا یہ (''مسلّمہ فرقوں'' کو ماننے والے) حضرات کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ ﷺ سے (جسے بھی وہ اپنے عقیدہ کے مطابق

''سنت'' سمجھتے ہوں) اس امر کا اشارہ تک بھی پیش کر سکتے ہیں کہ اسلام شخصی قوانین اور ملکی قوانین میں تفریق کرتا ہے؟۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصور اس دور میں پیدا ہوا جب سیاست کو مذہب (دین) سے الگ کر لیا گیا۔ ملکی قوانین، اہلِ سیاست نے اپنے پاس رکھے اور شخصی قوانین کو مذہبی پیشوائیت کی طرف منتقل کر دیا۔''

اسلامی قوانین کے راستے میں حائل کون؟۔ طلوعِ اسلام مارچ ۱۹۷۸ء ص۔ ۶۸:۔ ''پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین کے راستے میں کون حائل ہے؟۔ جو تصریحات آپ کے سامنے آچکی ہیں ان سے آپ خود فیصلہ فرما لیجئے۔ اس کے راستے میں خود ہمارے علماء کرام حائل نہیں تو اور کون حائل ہے؟۔ ان حضرات کا مطالبہ ہے کہ:۔ (۱)۔ اسلامی قوانین کی بنیاد کتاب وسنت پر ہونی چاہیئے۔ (۲)۔ دنیا میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس کے مندرجات کو تمام علماء (مختلف فرقے) متفقہ طور پر سنت رسول اللہ ﷺ تسلیم کر لیں۔ (۳)۔ نہ ایسی کتاب موجود ہے، نہ ہی یہ حضرات ایسی کتاب مرتب کر کے دیتے ہیں۔ (۴)۔ انہیں اس کا اعتراف ہے کہ کتاب وسنت کی رو سے پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہء قوانین مرتب نہیں ہو سکتا، جسے مختلف فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ (۵)۔ یہ اعتراف بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کہ کتاب وسنت کے مطابق ضابطہء قوانین مرتب کیا جائے۔۔۔۔ اور جب ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو پاتا تو دہائی مچادی جاتی ہے کہ اربابِ اقتدار، مغرب زدہ دانشور، سوشلسٹ، کمیونسٹ، منکرینِ حدیث، ملحدین، مرتدین، یہ چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں۔ (۶)۔ اور ان سے کوئی نہیں کہتا کہ آپ ان ''بے دینوں'' کے چاہنے یا نہ چاہنے کی طرف نہ جائیے۔ آپ سنتِ رسول اللہ ﷺ کا کوئی ایسا مجموعہ مرتب کر دیجئے (یا اس کی نشان دہی کر دیجئے) جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر سنتِ رسول اللہ ﷺ قرار پائے۔۔ اس کے بعد اگر، ایسا ضابطہء قوانین مرتب اور نافذ نہ ہو تو پھر جو جی میں آئے کہیئے۔ ہم ملک کے بہی خواہ اربابِ علم وبصیرت کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ ان (علماء) حضرات سے ضرور یہ سوال کریں، تاکہ ملک اس مسلسل خلفشار سے نجات حاصل کر سکے جو یہاں اسلام کے نام پر برپا کیا جاتا ہے۔''

(جاری ہے)

***

سانحہ ہائے اِرتحال

قاضی کفایت اللہ صاحب کی وفات کی خبر کو ابھی کچھ دِن ہی گذرے تھے کہ ''صوت الحق'' کے مدیر حسین امیر فرہاد صاحب کے انتقال کی اطلاع آگئی۔

''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے'' دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ادارہ مرحومین کے اعزہ اور اقرباء کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

روزوں کا مقصود و مدعا

پرویز صاحب کا ایک درسِ قرآنِ مجید

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (۱۸۳۔۱۸۷/ ۲) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں' اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۴/۱۱۳)

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز' عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں

سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہوگئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (۲/۱۸۳)۔ ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (۲/۱۸۳)۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (۲/۱۸۵) وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ (۲/۱۸۵)۔

تَتَّقُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تَشْكُرُوْنَ سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ (۲/۱۸۵)

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔ اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ تَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ط (۱۰/۷۸) ''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے''۔ اس سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں' یا رائے سرکشی نہیں: وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ص وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷)۔ ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ ط (۴۳/۸۴)۔ ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار'' (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے۔ لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی از خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (الْمُدَّثِّرُ کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَاَنْذِرْ ''اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے''۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (۷۴/۱۰۲)۔ ''اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔ یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا''۔ اور اس سے آگے ہے: وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا۔ (۱۷/۱۱۱) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو''۔ اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ: الْمُتَكَبِّرُ ط (۵۹/۲۳) کہا ہے۔ کہیں الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ (۱۳/۹) اور کہیں: الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۲/۶۲)۔ ہماری دنیا میں وہ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہو گی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہو گی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴)۔

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے' وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہو گی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ط وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط (۹/۴۰)۔

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے' عملاً مسلط ہو جائے۔

اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ (۹/۳۳)۔

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظام خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗٓ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے الْاَعْلَوْنَ اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں الْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸)۔ ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا (۴/۱۴۱)۔

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ الاعلی میں نہیں۔ سبحن ربی الاعلی۔۔ الاعلی کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں' جو ہمیں الْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے' مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ (۷/۱۴۶)۔

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہوگی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىکُمْ۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس

تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تا کہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ ۔۔۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تا کہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵)۔ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ؕ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ۔ (۱۰/۵۸)۔

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ تا کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین' مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآن کریم کا کوئی سا بامترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔ ''تا کہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم' خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں' ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست' لیکن یہ تکبیریں ایک بلند

مقصد کے حصول کا ذریعہ یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ وفغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' وَالْمَلٰٓئِكَةُ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ (۳/۱۷) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض وغایت اور رمضان کا مقصود ومنتہیٰ۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۲/۱۲۷)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

روح انسانی کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے

(1) اس زمین پر زندگی کی ابتداء ہوئی وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ (21/30) ترجمہ اور ہم نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ کیا یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے۔

(2) جرثومہ اولین Protoplasm نے Cell کی صورت اختیار کی۔ اس کو قرآن کریم نے طین لازب کہا ہے۔ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ (37/11) ہم نے انہیں طین لازب (چپچپی مٹی) سے پیدا کیا۔

(3) بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ (32/7) ترجمہ، انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے ہوئی۔

(4) تالوبوں کی تہ میں اور جوہڑوں کے کنارے پر جو مٹی دکھائی دیتی ہے یہ طین لازب ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (15/26) (ترجمہ) بیشک ہم نے انسان کو خمیر شدہ گارے سے بنایا جو سوکھ کر بجنے لگا۔

پانی اور مٹی کی آمیزش سے جرثومہ حیات نے پیکر کی صورت اختیار کی ان Cells کے اندر ایک لیس دار مادہ نیوکلیئس ہوتا ہے۔ یہ لیس دار مادہ زندگی کا آغاز اور نفس واحد ہے (4/1) اس نفس واحدہ سے جاندار مخلوق کی مختلف شاخیں پھوٹیں۔ چونکہ اس میں نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی اس نے اسی کو نفس واحدۃ کہا گیا ہے۔ وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤی اَرْبَعٍ ؕ (24/45) ترجمہ اللہ نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔ ان میں سے وہ بھی جو پیٹ کے بل چلتا ہے اور ان میں سے ہی ہے جو دو پاؤں پر چلتا ہے اور ان میں سے وہ ہے جو چار پاؤں پر چلتا ہے۔

زندگی کی بڑی شاخ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں اِدھر اُدھر پھوٹیں اس لیے اس حد تک یہ مختلف اقسام کی مخلوق دراصل ایک ہی نوع کی مختلف شکلیں اور ایک ہی قافلہ کے مختلف افراد ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِی الْكِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ثُمَّ اِلٰی رَبِّهِمْ یُحْشَرُوْنَ (6/38) ترجمہ: اور زمین پر چلنے والا کوئی حیوان اور ہوا میں پروں سے اُڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں جو تمہاری

ہی طرح اُمت نہ ہو۔ اور ہم نے کتاب میں کوئی فرد گذاشت نہیں کی۔ پھر سب اپنے رب کے حضور جمع کئے جائیں گے۔ یہاں اُمم امثالکم کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی جس قدر ذی حیات انواع وجود میں آئیں وہ شکل وصورت میں تو الگ الگ ہیں لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے مثل ہیں۔ اس آیہ کریمہ میں اُمم امثالکم کے الفاظ آئے ہیں۔ امم کا لفظ ام کی جمع ہے جس کے معنی ماں کے ہیں اور مجازی معنی اصل وبنیاد۔ آیۂ کریمہ کا مفاد یہ ہے کہ یہ سب پرندے اصل اور جڑ کے اعتبار سے اور یہ تمام انواع تمہاری مثل اور تمہاری جیسی ہیں۔ اس کے بعد سلسلہ ارتقاء میں نر اور مادہ کا امتیاز بھی شروع ہوا۔ فرمایا: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ط (35/11) (ترجمہ) اور اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے اور پھر تمہیں جوڑے بنایا یعنی زندگی اب اس مقام پر آ گئی Life Cell میں جنسی تخلیق شروع ہوگئی۔ ارشاد فرمایا: هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (7/189) ترجمہ: اللہ وہ ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ (جرثومہ حیات) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے۔ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (51/49) ترجمہ اور ہم نے ہر شے سے جوڑے بنائے گئے اور ان باتوں کا ذکر اس سے کیا تا کہ تم اس سے بھولی ہوئی حقیقتوں کو کو یاد کر سکو۔

زندگی اسی طرح رواں دواں چلتی رہی۔ عرصہ طویل اور مدت مدید کے بعد زندگی انسانی سطح پر پہنچ گئی۔ اس پیکر انسانی کو بتدریج درست کیا گیا۔ اس کو حشو وزوائد سے پاک کر کے اس کو دائرہ بشریت میں داخل کر دیا۔

الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (82/7)

وہ ذات جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر ہر طرح سے دوست کیا پھر۔ (اعضا میں) تناسب پیدا کیا پھر اسے احسن تخلیق بنایا (95/4) ترجمہ: ہم نے انسان کو بہترین ہیئت پر پیدا کیا۔

ارشاد ہوا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (32/9) ترجمہ: پھر اسے درست کیا اور اپنی طرف سے ایک توانائی (روح) ڈال دی۔ یعنی اس میں سماعت، بصارت اور غور وفکر کی صلاحیت ڈال دی (32/9)، اس آیہ کریمہ کے ان الفاظ نے روح یا توانائی کو Define کر دیا ہے کہ روح سے مراد انسان میں سماعت وبصارت اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ز نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا (76/2) یقیناً ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا جو باہمی مل جانے والا ہوتا ہے پھر ہم اسے مختلف حالتوں میں بدلتے رہے یہاں تک کہ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہو گیا۔

ہم مسلمانوں میں عام طور پر مسئلہ ارتقاء کو قرآن کریم کے خلاف خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس نظریہ کا بانی

ڈراون ملحد اور دیریہ تھا لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ تو ڈارون اس نظریہ کا بانی تھا اور نہ ہی وہ ملحد و دیریہ تھا۔ اس کی سوانح حیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو مانتا تھا۔ جب اس نے اپنے آبائی فن علم طب کی تعلیم سے فراغت پائی۔ تو اس کے نظریات میں ایک دم انقلاب آ گیا اور وہ روحانیت کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے کیمرج یونیورسٹی سے عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کی جہاں تقابل ادیان کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے خطبات بہاولپور میں بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے کہ اس دوران ڈارون نے اسلام کا مطالعہ کرنے کے لیے عربی زبان سیکھی۔ اس کے خطوط کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں کئی خطوط شامل ہیں جو اس نے اپنے عربی زبان کے استاد کے نام تحریر کئے تھے۔ ان خطوط میں اس نے اپنے استاد کی بے حد عزت کی ہے کیمرج یونیورسٹی میں جو عربی نصاب کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں یا تو ابن مسکویہ کو ''الفوز الاصغر'' اور اخوان الصفا'' کے اقتباسات ہوں گے، جو مسئلہ ارتقاء پر لکھے گئے ہیں۔ ابن مسکویہ اور اخوان الصفا نے مسئلہ ارتقاء کی وضاحت بہت تفصیل سے کی ہے۔ مولانا روم جو تیرہویں صدی کے عالم تھے انہوں نے کی مقامات پر مسئلہ ارتقاء کو بیان کیا ہے ہم مسئلہ ارتقاء سے متعلق ان کے چند اشعار مختلف مقامات سے لیکر پیش خدمت کرتے ہیں۔

مولانا روم کی مثنوی بہت آسان زبان میں ہے۔ یہ اشعار بھی بہت آسان فارسی میں ہیں تاہم اس کے باوجود ہم اس کا ترجمہ میں تحریر کر لیتے ہیں۔

''انسان شروع میں جماد تھا۔ جماد سے نبات بنا سال ہا سال نبات رہا۔ لیکن نباتی زندگی اسے یاد نہیں۔ پھر نبات سے جب حیوان بنا تب بھی نباتی حالت اُسے یاد نہیں۔ پھر حیوان سے انسان کی جانب اُسے وہ خالق لے جاتا ہے جو اُسے جانتا ہے۔ غرض اس طرح وہ ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف چلتا رہا یہاں تک کہ وہ عامل و دانا بن گیا'' مولانا روم صاف بتا رہے ہیں کہ انسان کی بتدائی خلقت جمادی و مادی ہے۔ اس سے ارتقاء پذیر ہو کر اس نے نباتی جسم اختیار کیا۔ پھر عالم نبانات سے وہ جسم حیوانی بنا اور جسم حیوانی سے اس نے جسم انسانی اختیار کیا اور جسم انسانی اختیار کرنے کے بعد عقل و دانائی و شعور کی منزل پر پہنچ گیا۔

ایک دوسری جگہ مولانا فرماتے ہیں:

(1) از جمادی مردم شدم — وز نما مردم بہ حیوان سر زدم

(2) مردم از حیوانی و آدم شدم — پس چہ ترسم کی ز مردن کم شدہ

(3) حملۂ دیگر بہ میرم از بشر — تا برآرم از ملائک بال و پر

ترجمہ:

(1) میں جمادات میں تھا اور مر کر نباتی بنا۔ نباتات کے روپ میں مرا اور پھر جو آیا تو حیوان کہلایا۔

(2) جب حیوان مرا، تو آدمی ہو گیا۔ میں موت سے کیوں ڈروں، مجھے موت نے کب کم کیا۔

(3) اب جو مروں گا تو فرشتہ بنوں گا۔ اور بال و پر نکالوں گا

ظاہر ہے یہ تمام علم مولانا کو قرآن کریم سے ہی حاصل ہوا تھا۔

روح کی تردید اور نفس انسانی کی تائید میں قرآن کریم میں دو آیات بہت واضح ہیں۔ ہم نے ان دونوں آیات کی تشریح اپنے ایک مضمون میں جو رسالہ طلوع اسلام میں طبع ہوا تھا، درج کی تھی، ہم وہ سطور یہاں نقل کرتے ہیں۔

روح کی تردید کے بارے میں جو دو آیات بہت واضح ہیں یہ سورۃ انعام اور سورۃ زمر (6/60) اور (39/42) میں آئی ہیں۔ آپ ان دونوں آیات کو معہ ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (6/60) (ترجمہ) اور وہی خدا ہے جو تمہیں رات کو اٹھا لیتا ہے اور جو کچھ تم نے دن میں کیا وہ جانتا ہے۔ پھر تم کو دن میں اٹھا کھڑا کرتا ہے تا کہ زندگی کی وہ معیاد جو متعین ہے پوری ہو جائے۔ پھر تم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے پھر تم دنیا میں جو کچھ کرتے رہے وہ تمہیں بتائے گا۔

(2) سورہ زمر میں یہی مضمون اس طرح ارشاد ہوتا ہے اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (39/42) (ترجمہ) خدا ہی لوگوں کے مرنے کے وقت اُن کی نفوس اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو لوگ نہیں مرے ان کی نیند میں۔ بس جن کے بارے میں خدا موت کا حکم دے چکا ہے ان کی نفوس کو روک لیتا ہے اور باقی کو ایک مقررہ وقت تک کے واسطے بھیج دیتا ہے۔ جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں ان کے لیے یقیناً بہت نشانیاں ہیں۔

یہ دونوں آیات بڑے غور کی متقاضی ہیں۔ ہمارے سابقہ مفسرین چونکہ سائیکلوجی کے علم سے ناواقف تھے اس لیے وہ اس آیت کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکے۔ اس دور میں بھی ان آیات کو وہ ہی سمجھ سکتا ہے جس کو سائیکلوجی کے علم سے واقفیت ہو اور اس علم میں ذہن انسانی جہاں تک پہنچ چکا ہے اس کا اس کو علم ہو۔ بہر حال ان آیات کی حتمی تفسیر آئندہ کے دور میں سمجھ میں آئے گی۔ لیکن ایک بات طے

شدہ ہے کہ ان آیات سے یہ بات ضرور ثابت ہوجاتی ہے کہ قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ کیونکہ اس دور میں جب قرآن نازل ہورہا تھا اس قسم کے مباحث ذہن میں آ ہی نہیں سکتے تھے اور نہ کوئی شخص اس علم کے رموز سے واقف تھا۔ اس وقت یہ لطیف مسائل وحی الٰہی ہی بتاسکتی تھی۔ علم نفسیات کو Involve کئے بغیر روایتی تفاسیر میں اس آیت کی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں یہ تحریر کی گئی ہے۔ ''قرآن نے یہاں ہر شب میں سونے کو وفات اور ہر صبح کو اٹھنے کو بعث سے تعبیر کرکے توجہ دلائی ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو ہر روز ہورہا ہے۔ جس طرح تمہارا سونا اور جاگنا ہے اسی طرح تمہارا مرنا اور اٹھنا ہے اور جس طرح تم میں سے کسی سونے والے کے دن کے اعمال سے خدا لاعلم نہیں ہے۔ اس طرح جب تم موت کی نیند سوؤ گے تو خدا تمہاری زندگی کے اعمال کو بھول نہیں جائے گا اور جس طرح تمہاری ہر شب کی نیند کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے ہو اس طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی اور تم ایسا محسوس کرو گے کہ یہ جو کچھ ہوا سب صبح وشام کا حصہ تھے۔''

ان دونوں آیات کا مفاد یہ ہے کہ نفوس کو وفات دیتا ہے۔ ان کی موت کے وقت اور جو لوگ مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں پھر جن لوگوں پر موت وارد ہوتی ہے ان کے نفوس کو روک لیتا ہے اور جن پر موت طاری نہیں ہوتی ان کے نفوس کو واپس بھیج دیتا ہے ایک متعین مدت کے لیے۔ نیند اور موت کے وقت نفس انسانی (شعور) کو روک لینے کو قرآن نے وفات دینے سے تعبیر کیا ہے۔ نیند میں شعور کام نہیں کرتا۔ اگرچہ معطل In-active ہوجاتا ہے۔ لیکن معدوم نہیں ہوتا۔ صرف وقتی طور پر معطل ہوجاتا ہے۔ کیونکہ نیند سے بیدار ہونے پر اُسے واپس کردیا جاتا ہے۔ اس آیت میں نفس سے مراد انسانی شعور ہے اور وفات دینے سے مراد اُسے عارضی طور پر معطل کرنا ہے۔ نیند اور موت دونوں حالتوں میں انسانی شعور معطل ہوجاتا ہے۔ موت کی حالت میں اسے واپس نہیں کیا جاتا۔ وہاں ہی روک لیا جاتا ہے۔ نیند کی حالت میں واپس کردیا جاتا ہے۔ دونوں آیات کے مطابق موت میں بھی شعور کو معطل کیا جاتا ہے۔ شعور معدوم کسی حالت میں بھی نہیں ہوتا۔ ان دونوں آیات نے موت اور نیند کے فرق کو واضح کردیا ہے۔ لیکن آپ ملاحظہ فرمارہے ہیں کہ روح کا کوئی تذکرہ ان دونوں آیات میں نہیں آتا ہے۔ یہ دونوں آیات روح کے تصور کی تردید کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں اگر کوئی صاحب روح کی تردید کے موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں تو Google پر جاکر Soul اور Spirit پر جمع کروہ لٹریچر ملاحظہ فرمالیں۔ ان کے لئے ایک نئی دنیا کا دروازہ کھلا ہوگا اور اس قدر مواد ہے کہ سالوں ختم نہیں ہوگا۔

عقیدہ روح کی تردید کے سلسلہ میں ہم جو کچھ عرض کرنا مناسب سمجھے ہم نے جناب کی خدمتِ عالیہ میں پیش کردیا اور اس طرح سے یہ مضمون مکمل ہوگیا ہے اس خیال سے کہ روح کا لفظ چونکہ قرآن کریم میں بیس مقامات پر آیا ہے۔، اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ ان آیات کی تفسیر بھی تحریر کردی جائے۔ اس سے یہ بات مزید واضح ہوجائے گی کہ روح کا لفظ جب بھی قرآن میں آیا ہے وہ اس

مفہوم میں نہیں آیا جو ہمارے مفسرین لیتے ہیں اور جو Soul اور Spirit کہلاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کریم عربوں کی اس زبان میں نازل ہوا جو عرب روز مرہ استعمال کرتے تھے۔ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ (51/23) آسمان وزمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے اس کا انداز کلام بالکل اسی طرح کا ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔ قرآن کریم نے ان میں روز مرہ کے الفاظ پر الف لام کا اضافہ کر کے اس کو اپنی اصطلاح بنالیا ہے۔ الصلوٰۃ، الزکاۃ، الصوم، الحج، الروح، یہ سب قرآن کریم کی اصطلاحیں ہیں اور ان کے وہ معانی لینے چاہئیں جو نزول قرآن کے وقت عرب ان کے معانی لیتے تھے۔ وہ ہی Original معانی ہیں۔ لیکن ہم مسلمانوں کے ساتھ یہ بہت بڑی سازش ہوتی ہے کہ جب اڑھائی سو سال کے بعد ہمارا لٹریچر یعنی تفاسیر وکتب روایات ضبط تحریر میں آئیں تو اس وقت ان اصطلاحات کے غیر قرآنی مفہوم رواج پا چکے تھے۔ اس بات کو ثابت کرنا پہلے تو ذرا مشکل بات تھی لیکن اب ہمارے اس خیال ل کی تائید حاصل کرنا بہت آسان ہو گیا ہے۔ آپ کمپیوٹر پر Google پر جائیں اور قرآنی اصطلاحات کے مفاہیم وہاں تلاش کریں تو آپ پر عجیب انکشافات ہوں گے۔ آپ Majoose Worship یا Zoroshian worship پر Click کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مجوسی جو پرستش کرتے تھے وہ بھی اپنی پرستش کی رسم کو نماز کہتے تھے۔ اور وہ بھی پانچ وقت ہی نماز پڑھتے تھے۔ ان کے ہاں درود بھی تھا ہمارے ہاں یہ نام وہاں سے ہی آئے ہیں۔ نزول قرآن کے وقت عربوں میں یہ سودانوں والی تسبیح Rosory نہیں ہوتی تھی۔ یہ سودانوں والی تسبیح بدھ مت میں تھی وہاں سے یہ ہندوؤں میں آئی۔ ہندوؤں سے یہ ایرانیوں میں آئی اور جب بنو عباس کے دور میں ہمارے ہاں قرآن کریم کی تفاسیر معرض وجود میں آئیں، جو زیادہ تر ایرانیوں کی تحریر کردہ ہیں تو انہوں نے تسبیح کرنے کا ترجمہ یہ سودانے والی تسبیح پڑھنا کر دیا جو ہم مسلمان اب پڑھتے ہیں۔

نزول قرآن کے وقت عربوں میں فلسفہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ عربوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ فلسفہ کیا علم ہے۔ بنو عباس کے دور میں یونانی کتب کے تراجم ہوئے اور عرب فلسفہ سے واقف ہوئے اور قدریہ، جبریہ، اشاعرۃ اور معتزلہ کے مکاتب فکر وجود میں آئے۔ اسی دور میں روح کا تصور بھی ان کے ہاں رائج ہوا اور روح کے وہ معنی جو نزول قرآن کے وقت تھے وہ ترک کر کے روح کے معنی Soul یا Spirit کر دیئے گئے۔ روح کو مادہ کے مقابل لایا گیا اور مادہ، اور مادی چیزوں سے نفرت پیدا کی گئی اور اس تصور نے تصوف کی بنیاد فراہم کر دی۔ روح کے معنی بمعنی Soul اور Spirit ساری دنیا کے مذاہب میں موجود تھے۔ یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے اس عالمگیر نظریہ کی تردید کر کے نفس کا تصور انسانیت کو دیا۔ روح اور نفس ایک ہی چیز کے دو رُخ ہیں۔ اس کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے تو اس کے لیے روح کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور جب اس کی نسبت انسان کی طرف کی جاتی ہے تو قرآن اس کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ جب روح خداوندی (توانائی) انسان کو عطا کر دی جاتی ہے تو اسے قرآن کی اصطلاح میں نفس کہا جاتا ہے۔ (91/7) اب انسانیت کا تعلق نفس سے ہے۔ روح یا روحانیت سے نہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لغات القرآن

ن س خ

نَسۡخٌ کے معنی ہیں ایک چیز کو مٹا دینا اور اس کی جگہ دوسری چیز کو لے آنا۔ دوسری چیز کو اس کے قائم مقام کر دینا (ابن فارس)۔ نَسَخَتِ الشَّمۡسُ الظِّلَّ۔ آفتاب نے سایہ کو ہٹا دیا اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ یا کسی چیز میں تبدیلی کر دینا۔ نَسَخَتِ الرِّیۡحُ آثَارَ الدِّیَارِ۔ ہوا نے آبادی کے آثار (نشانات وعلامات) کو تبدیل کر دیا (یعنی وہ کھنڈرات وغیرہ جن سے آبادی کا پتہ نشان ملتا تھا انہیں ریت سے ڈھانک کر دگرگوں کر دیا)۔ نَسَخَ الۡکِتَابَ۔ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب مرتب کر لینا۔ اسی سے اَلنُّسۡخَۃُ منقول (Copied) کتاب کو کہتے ہیں (تاج۔ محیط وراغب)۔ قرآن کریم میں ہے اِنَّا کُنَّا نَسۡتَنۡسِخُ (45:29)۔ ''ہم لکھوا لیتے تھے''۔ مٹا دینے یا زائل کر دینے کے معنوں میں یہ لفظ (22:52) میں آیا ہے۔ فَیَنۡسَخُ اللّٰہُ ''اللہ مٹا دیتا ہے''۔

لہٰذا نَسۡخٌ کے بنیادی ہیں ایک چیز کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔ اس لفظ کی اہمیت اس لئے ہے کہ ہمارے ہاں ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ چلا آ رہا ہے اور اسے دین کے مہمات میں سے سمجھا جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہے بھی بہت اہم۔ اس لئے کہ اس کا غلط مفہوم دین کو اس کی جڑ سے اکھیڑ دیتا ہے اور اس کا صحیح مفہوم قرآن کو خدا کے دین کا آخری اور واحد ضابطہ ثابت کر دیتا ہے۔

ناسخ ومنسوخ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم میں متعدد آیات ایسی ہیں (بعض کے نزدیک ان کی تعداد پانچ سو تک ہے) جو پڑھی تو جاتی ہیں لیکن جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ پھر سن لیجئے کہ (اس عقیدہ کے مطابق) قرآن کریم میں پانچ سو کے قریب ایسی آیات ہیں جنہیں محض ''ثواب'' کی غرض سے پڑھ لیا جاتا ہے لیکن ان میں جو احکام ہیں وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض احکام قرآن کریم کی دوسری آیات نے منسوخ کر دیئے ہیں اور بعض احکام احادیث نے منسوخ کر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے (مثلاً آیۂ رجم۔ یعنی زانی کو سنگسار کرنے کے حکم والی آیت)۔ اس عقیدہ کی رو سے قرآن کریم کی شکل یوں بنتی ہے کہ:

(1) قرآن کریم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کے احکام تو منسوخ ہو چکے ہیں لیکن جن کی تلاوت ہوتی رہتی ہے۔ اور

(2) ایسی آیات بھی ہیں جو قرآن کریم کے اندر تو نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ دوسری قسم کی آیات کے لئے تو دلیل صرف روایات کی ہے۔ لیکن پہلی قسم کی آیات کے لئے خود قرآن کریم ہی کی ایک آیت سے دلیل لائی جاتی ہے۔ اور وہ آیت یہ ہے۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِہَا نَاۡتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡہَاۤ اَوۡ مِثۡلِہَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ (2:106)۔

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

ہم جس آیت کو بھی منسوخ کر دیتے ہیں یا اسے فراموش کرا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔

اس کا مطلب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن کریم میں کسی بات کا حکم دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے سوچا کہ اس حکم کو منسوخ کر دینا چاہئے۔ چنانچہ اس نے ایک اور آیت نازل کر دی جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا۔ یہ حکم اس سے پہلے حکم سے بہتر ہوتا تھا۔ واضح رہے کہ اس نئی آیت میں یہ کہیں نہیں بتایا جاتا تھا کہ اس سے فلاں آیت کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس لئے قرآن کریم میں منسوخ آیات بھی اسی طرح سے موجود ہیں اور ناسخ آیات بھی۔ اللہ نے ان کے متعلق کہیں نہیں بتایا کہ فلاں آیت منسوخ ہے فلاں آیت سے۔ یہ تعین بعد میں روایات کی رو سے یا مفسرین کے اپنے خیالات کی رو سے کیا گیا۔ چنانچہ ان آیات کی تعداد ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان کی تعداد صرف پانچ ہے۔

باقی رہا ''فراموش کرا دینے'' کا سوال۔ سو اس کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتی تھیں لیکن رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) انہیں بھول جاتے تھے۔ تو پھر انہی جیسی آیات اور نازل ہو جاتی تھیں۔ یہ مراد ہے اَوۡ نُنۡسِهَا سے۔ اس کی دلیل میں یہ آیۃ پیش کی جاتی ہے۔ سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ... (87:6-7)۔ جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا' ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے۔

اس عقیدہ کی رو سے آپ دیکھئے کہ خدا' قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا تصور اس قسم کا کہ وہ آج ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات بتا دیتے ہیں کہ وہ حکم ٹھیک نہیں تھا اس لئے وہ قرآن کریم کے اس حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔

قرآن کریم کے متعلق یہ کہ اس میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تلاوت برابر ہو رہی ہے اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی ناسخ۔ اسے لوگوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ خود اس کا فیصلہ کریں کہ کونسی آیت منسوخ ہے اور کونسی اس کی ناسخ۔

اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ تصور کہ حضور ﷺ خدا کی طرف سے نازل کردہ قرآنی آیات کو بھی بھول جایا کرتے تھے۔ یا للعجب!

ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم آگے آئے گا۔ سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى کے صحیح مفہوم کے لئے عنوان ن۔س۔ی دیکھئے جہاں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔

اب دیکھئے اس آیت (مَا نَنۡسَخۡ...) کا صحیح مفہوم۔ پیچھے سے سلسلۂ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب (بالخصوص یہود) قرآن کریم اور رسالت محمدیہ ؐ پر مختلف اعتراضات کرتے ہیں (قرآن کریم ان اعتراضات کا جواب دیتا ہے)۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک اعتراض یہ بھی تھا (اور یہ اعتراض بڑا اہم تھا) کہ جب خدا نے انبیاء سابقین (مثلاً حضرت موسیٰؑ وغیرہ) پر اپنے احکام نازل

کر دیئے تھے اور وہ احکام توریت وغیرہ میں موجود ہیں۔ تو پھر ان کی موجودگی میں اس نئے رسول اور نئی کتاب کی ضرورت کیا تھی؟ اس آیت میں اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت حضرت نوحؑ کے زمانے سے مسلسل چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو وحی بھیجی جاتی تھی ان میں ایک حصہ ان احکامات پر مشتمل ہوتا تھا جو وقتی ہوتے تھے اور ان کا تعلق خاص اسی قوم سے ہوتا تھا جس کی طرف وہ احکام بھیجے جاتے تھے اور انہیں انہی حالات میں نافذ العمل رہنا ہوتا تھا جو اس زمانے کے تقاضے سے پیدا ہوئے تھے۔ بعد میں، جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضوں سے وہ حالات بدل جاتے تو ایک اور رسول آ جاتا اور وہ ان احکام کی جگہ دوسرے احکام لے آتا۔ اس طرح یہ جدید وحی اس سابقہ وحی کی قائم مقام (ناسخ) بن جاتی۔ یہ سلسلہ شروع ہی سے ایسا چلا آ رہا ہے۔ چنانچہ تم خود دیکھ رہے ہو کہ توریت کے کتنے احکام ہیں جنہیں حضرت عیسیٰؑ نے آ کر بدل دیا (یہ بدلے ہوئے احکام انجیل میں موجود ہیں)۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانیت کے تقاضے اور اس کی ذہنی سطح بھی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی آ رہی ہے۔ اس لئے ہر قوم کو اس کے حالات اور ارتقائی سطح کے مطابق ہی احکام دیئے جاتے تھے۔ ان کی سطح سے بلند احکام و قوانین روک لئے جاتے تھے۔ تا آنکہ ان کے بعد دوسری قوم آتی جو ارتقائی منزل میں ان سے آگے ہوتی۔ تو وہ ''روکے ہوئے'' احکام و قوانین اس وقت نازل کر دیئے جاتے۔ تنزیل وحی میں یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے۔

نیز یہ شکل بھی ہوتی کہ ایک رسول کے چلے جانے کے بعد، اس کی قوم اس کی وحی کے بعض حصوں کو ترک کر دیتی۔ بعض کو فراموش کر دیتی۔ اس لئے ان ترک کردہ یا فراموش کردہ حصوں کو (جن میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہ ہوتی) بعد میں آنے والے رسول کی وحی سے از سر نو تازہ کر دیا جاتا۔

یہود سے کہا گیا کہ وحی کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے۔ اب وہ دور آ گیا ہے جس میں انسانی شعور پختگی حاصل کر لے گا۔ لہٰذا اب انتظام یہ کیا گیا ہے کہ۔

(1) سابق انبیاء کی وحی کے وہ تمام احکام جو ان کی قوم کے حالات اور ان کے زمانے کے تقاضوں کے ساتھ مخصوص تھے منسوخ کر کے ان کی جگہ، دوسرے احکام و قوانین بھیج دیئے جائیں اور چونکہ وحی کا یہ سلسلہ اب ختم ہو رہا ہے اس لئے یہ احکام وقتی اور ہنگامی نہیں ہوں گے بلکہ ابدی طور پر انسانیت کا ساتھ دینے والے ہوں گے۔ اس لئے یہ احکام و قوانین سابقہ احکام سے بہتر ہوں گے۔

(2) وہ قوانین جنہیں پہلے روک لیا گیا تھا کیونکہ ہنوز انسانیت اس سطح پر نہیں پہنچ سکی تھی کہ انہیں سمجھ سکے یا اپنا سکے، اب انہیں بھی نازل کر دیا جاتا ہے، کیونکہ قرآن کریم انسانیت کی بلند ترین سطح تک اس کا ساتھ دے گا۔

(3) اور سابق انبیاء کی وحی کے وہ احکام و قوانین جنہیں ان کی قوموں نے ترک کر دیا تھا۔ یا فراموش کر دیا تھا (یا جن میں انہوں نے تحریف کر دی تھی) ان کی تجدید کر دی گئی ہے (ان کی مثل احکام دے دیئے گئے ہیں)۔

یہ ہے وہ ضرورت جس کے لئے ایک نئے رسول اور نئی کتاب کو بھیجا گیا ہے اور یہ ہے وہ وجہ کہ اب تمام سابقہ کتابوں کی جگہ اسی قرآن کریم پر ایمان لانا اور اس پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ اب اس کے سوا ہدایت کی کوئی اور راہ نہیں۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ (2:137) اگر یہ بھی اسی طریق پر ایمان لائیں جس طرح (اے جماعت مومنین) تم ایمان لائے ہو تو پھر یہ لوگ ہدایت پا سکیں گے اور اگر اس راہ سے اعراض برتیں گے تو پھر خدا کے راستے کے مخالف سمت جائیں گے۔

یہ ہے صحیح مفہوم مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا کا۔ اب دیکھئے کہ ان الفاظ کے لغوی معنی کس طرح اس مفہوم کے آئینہ دار بنتے ہیں۔

نَسَخَ کے معنی ہم نے اوپر دیکھ ہی لئے ہیں۔ کسی چیز کی جگہ کسی دوسری چیز کو لے آنا۔ آیت کے معنی صرف قرآن کریم کی آیات نہیں۔ قرآن کریم نے ہر رسول کی وحی کو آیات اللہ کہا ہے۔ مثلاً اسی سورۃ بقرہ میں قصۂ آدم میں ہے کہ آدم سے کہا گیا۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38)- جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا اور اس سے آگے ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ (2:39)- ان کے برعکس، جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کریں گے اور ان سے انکار کریں گے..... یہاں سے ظاہر ہے کہ جہاں اور جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی ہے اسے آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ما ننسخ من آیۃ میں آیات سے مراد قرآن کریم کی آیات نہیں بلکہ اس سے مراد ہے کسی سابق وحی کی آیات کی تبدیلی بعد کی وحی کی آیات سے۔ جیسا کہ سورۃ نحل میں کہا گیا ہے۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (16:101)- ''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت بدل دیتے ہیں''۔

اس کے بعد لفظ نُنْسِهَا ہے۔ یہ لفظ نَسِیَ سے ہے۔ نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو ترک کر دینا' یا فراموش کر دینا' آتے ہیں۔ (دیکھئے عنوان ن۔س۔ی)۔ اس لفظ میں یہ ساری حقیقت آ جاتی ہے کہ سابقہ کتب آسمانی اپنی اصل حالت میں باقی نہیں رہتی تھیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ جو رسول بھی آیا اس کے ساتھ یہی ہوا کہ اس کی وحی میں سرکش اور مفسد لوگوں نے اپنی طرف سے کچھ ملا دیا۔ لیکن خدا کی طرف سے ایسا ہوتا رہا کہ ان کی اس آمیزش اور ملاوٹ کو الگ کر دیا جاتا اور اس طرح اللہ اپنی آیات کو از سر نو محکم کر دیتا (22:52)- یا وہ اس وحی کے کچھ حصے کو ترک ہی کر دیتے تھے۔ اس حصہ کو خدا نئے رسول کی وحی میں پھر شامل کر دیتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ایک آیت کی جگہ دوسری آیت (یا اس کی مثل اس جیسی آیت) سے مراد سابق وحی کی آیات ہیں نہ کہ قرآن کریم کی ایک آیت کی جگہ دوسری آیت۔

نَسِیَ کے معنی کسی چیز کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ اس اعتبار سے آیت نُنْسِهَا سے مفہوم یہ ہوگا کہ جن سابقہ احکام کے متعلق ہمارا فیصلہ یہ ہوتا کہ انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے' انہیں ہم نئے رسول کی وحی میں اسی طرح شامل کر دیتے۔

اس اعتبار سے قرآن کریم ایک طرف تمام انبیاء سابقہ کی وحی کا مُهَيْمِنٌ ہے (5:48)- یعنی اس کے اندر وہ تمام قوانین محفوظ ہو گئے ہیں اور دوسری طرف خدا کو جس قدر احکام نوع انسانی کے لئے دینے تھے' ان سب کی تکمیل ہو گئی ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (6:115)- نہ خدا کی طرف سے اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی ہے اور نہ انسانوں میں سے کوئی اس میں ردوبدل کر سکے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے (15:9)-

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا نے وحی کے سلسلہ کو اس طرح کیوں رکھا۔ تو اس کا جواب یہ کہہ کر دے دیا کہ: اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (2:106)- خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ انسانوں کو کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب انہیں مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے۔ یہ سب کچھ ان اندازوں کے مطابق ہوتا ہے جن پر اسے پوری پوری مقدرت حاصل ہے۔

یہ ہے ناسخ و منسوخ کا صحیح مفہوم۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں۔ اس کا ہر حکم اپنی جگہ محکم و غیر متبدل ہے۔ البتہ ہر حکم خاص حالات کے ماتحت نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ جب حالات بدل جائیں تو اس کی جگہ قرآن کا دوسرا حکم نافذ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ کے لئے وضو کا حکم ہے۔ لیکن اگر پانی نہ ملے یا انسان مریض ہو تو وضو کی جگہ تیمم کا حکم ہے (5:6)- ان حالات میں وضو کا حکم پیچھے ہٹ جائے گا اور تیمم کا حکم آگے آجائے گا۔ جب پانی مل جائے گا (یا مرض جاتا رہے گا) تو پھر وضو کا حکم آگے آجائے گا اور تیمم کا حکم پیچھے چلا جائے گا۔

یا مثلاً قرآن کریم نے چور اور زانی (وغیرہ) کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں چوری اور زنا کی وارداتیں نہ ہوں تو قرآن کریم کے (سزاؤں کے متعلق) احکام نافذ العمل نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کسی معاشرہ میں مفلس، محتاج، گداگر نہ رہیں تو خیرات وغیرہ سے متعلق احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ یا مثلاً اگر کوئی شخص ترکہ چھوڑ کر نہ مرے تو وراثت کے احکام اس پر نافذ نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے جس میں فالتو دولت یا جائداد کسی کے پاس نہ ہو تو وراثت کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ان امور کو ''ناسخ و منسوخ'' سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ احکام اپنی جگہ موجود رہتے ہیں۔ جب وہ حالات پھر پیدا ہو جائیں جن کے ماتحت انہیں نافذ ہونا تھا، تو وہ پھر نافذ ہو جاتے ہیں۔ ''منسوخ'' اسے کہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے ساقط ہو جائے اور کبھی نافذ نہ ہو سکے۔ قرآن کریم میں ایسا کوئی حکم نہیں۔

مَا نَنْسَخْ والی آیت (2:106)- یا سورۃ النحل کی آیت وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَۃً مَّکَانَ اٰیَۃٍ (16:101)- میں اگر آیۃ سے مراد کائناتی حوادث و وقائع لئے جائیں (جنہیں قرآن کریم متعدد مقامات پر ''آیات اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے) تو ''نسخ آیت'' سے مراد ہوگا نظام کائنات کے کسی ایک طریق یا مظہر کی جگہ کسی دوسرے طریق یا مظہر کا آجانا۔ ارباب علم و تحقیق سے پوشیدہ نہیں کہ کائنات میں اس قسم کے تبدلات کس طرح آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن چونکہ ہر دو مذکورہ بالا آیات کے سیاق و سباق کا تعلق وحی سے ہے اس لئے ہم پہلے بیان کردہ مفہوم کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ دوسرے مفہوم کی رو سے معانی میں بڑی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

اول الذکر مفہوم ہو یا ثانی الذکر، یہ حقیقت اپنی جگہ رہتی ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جو منسوخ ہو۔ اس غیر متبدل صحیفۂ آسمانی کا ایک ایک حرف اپنے مقام پر اٹل ہے اور اٹل رہے گا۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

* * *

دو اسلام

(جاوید چوہدری، روزنامہ ایکسپریس، 26 اپریل 2015ء)

گذشتہ دنوں ہمارے پرنٹ میڈیا میں غلام جیلانی برق مرحوم کے حوالے سے قرآن بمقابلہ روایات پر ایک بحث چھڑ پڑی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بحث سوشل میڈیا پر بھی زور پکڑ گئی۔ اس بحث میں ''طلوع اسلام'' کو بھی خواہ مخواہ میں گھسیٹ لیا گیا۔ برق مرحوم کو کبھی منکر حدیث ثابت کیا گیا اور کبھی ''من کی دُنیا'' میں ڈوب جانے والے صوفی کے طور پر پیش کیا گیا۔ سارا زور اس تکرار پر صرف ہوا کہ برق مرحوم قرآنِ کریم سے اپنی ابتدائی محبت پر آخری عمر میں نادم اور پریشان تھے یا نہیں۔ یہ بات کہ اُن کے شروع کے افکار قرآن اور براہین کی رو سے زیادہ صحیح تھے یا بڑھاپے کے زمانے کے نظریات قرین عقل ووحیِ الٰہی تھے، سرے سے زیر بحث ہی نہیں لائی گئی۔ قارئین طلوع اسلام کی دلچسپی کے لیے ہم پوری بحث شاملِ اشاعت کرنا چاہ رہے تھے لیکن گنجائش کی کمی کے باعث صرف اس بحث کے چھڑنے کا باعث بننے والے کالم اور پھر جواب در جواب میں چھپنے والا ایک آدھ کالم بلاتبصرہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق برصغیر کا عظیم دماغ تھے، یہ 1901ء میں اٹک میں پیدا ہوئے، والد گاؤں کی مسجد کے امام تھے، ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم مدارس میں حاصل کی، مولوی فاضل ہوئے، منشی فاضل ہوئے اور ادیب فاضل ہوئے، میٹرک کیا اور میٹرک کے بعد اسلامی اور مغربی دونوں تعلیمات حاصل کیں، عربی میں گولڈ میڈل لیا، فارسی میں ایم اے کیا اور 1940ء میں پی ایچ ڈی کی، امام ابن تیمیہ پر انگریزی زبان میں تھیسس لکھا، امامت سے عملی زندگی شروع کی، پھر کالج میں پروفیسر ہو گئے، آپ کے تھیسس کو آکسفورڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی نے قبولیت بخشی، اسلام پر ریسرچ شروع کی، 1949ء میں پاکستان کی تشکیل سے دو سال بعد ''دو اسلام'' کے نام سے معرکۃ الآراء کتاب لکھی اور پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا، یہ کتاب، کتاب نہیں تھی ایک عالمی انقلاب تھا۔ ''دو اسلام'' کے بعد ''دو قرآن'' اور ''من کی دنیا'' لکھی اور اسلامی دنیا کے پیاسے ذہنوں کو سیراب کر دیا، میں جب بھی ''دو اسلام'' اور ''دو قرآن'' پڑھتا ہوں اور آج کے پاکستان کی عدم برداشت، مذہبی تشدد

اور مکالمے کا قبرستان دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں ماضی کا پاکستان دانش، برداشت، علم اور مکالمے میں آج کے پاکستان سے کتنا آگے تھا تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے، ڈاکٹر غلام جیلانی برق اور ان کا پاکستان کس قدر بالغ تھا آپ یہ جاننے کے لیے ''دو اسلام'' کا صرف ابتدائیہ ملاحظہ کیجئے، میں اس ابتدائیہ کو چند جگہوں سے ایڈٹ کر رہا ہوں کیونکہ آج کا مسلمان ڈاکٹر برق کے مسلمانوں زمانہ کے سے بہت پیچھے ہے، ڈاکٹر صاحب جیسے دانشوروں اور مسلم سکالرز کی باتیں صرف ماضی میں ہی لکھی اور بیان کی جاسکتی تھیں، ہم لوگ آج ان کا تصور تک نہیں کر سکتے، کیوں؟ کیونکہ آج کے مسلمان میں سب کچھ ہے اگر نہیں ہے تو اسلام نہیں۔

''یہ 1918ء کا ذکر ہے، میں والد صاحب کے ساتھ امرتسر گیا، میں چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا، جہاں نہ بلند عمارات، نہ مصفا سڑکیں، نہ کاریں، نہ بجلی کے قمقمے اور نہ اس وضع کی دکانیں، دیکھ کر دنگ رہ گیا، لاکھوں کے سامان سے سجی دکانیں اور بورڈ پر کہیں رام بھجا سنت رام لکھا تھا، کہیں دُنی چند اگروال، کہیں سنت سنگھ سبل اور کہیں شادل لال فقیر چند۔ ہال بازار کے اس سرے سے اس سرے تک کسی مسلمان کی کوئی دکان نظر نہیں آئی، ہاں مسلمان ضرور نظر آئے، کوئی بوجھ اٹھا رہا تھا، کوئی گدھے لاد رہا تھا، کوئی کسی ٹال پہ لکڑیاں چیر رہا تھا اور کوئی بھیک مانگ رہا تھا، غیر مسلم کاروں اور فٹنوں پر جا رہے تھے اور مسلمان اڑھائی من بوجھ کے نیچے دبا ہوا مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔ ہندوؤں کے چہرے پر رونق، بشاشت اور چمک تھی اور مسلمان کا چہرہ فاقہ، مشقت، فکر اور جھریوں کی وجہ سے افسردہ و مسخ۔ میں نے والد صاحب سے پوچھا! کیا مسلمان ہر جگہ اسی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں؟ والد صاحب: ہاں! میں نے عرض کیا، اللہ نے مسلمان کو بھی ہندو کی طرح دو ہاتھ، دو پاؤں اور ایک سر عطا کیا ہے تو پھر کیا وجہ ہے ہندو تو زندگی کے مزے لوٹ رہا ہے اور مسلمان ہر جگہ حیوان سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔ والد صاحب: یہ دنیا مردار سے زیادہ نجس ہے اور اس کے متلاشی کتوں سے زیادہ ناپاک ہیں۔ اللہ نے یہ مردار ہندوؤں کے حوالے کر دیا ہے اور جنت ہمیں دے دی ہے، کہو کون فائدے میں رہا؟ ہم یا وہ؟ میں بولا ''اگر دنیا واقعی مردار ہے تو پھر آپ تجارت کیوں کرتے ہیں اور مال تجارت خریدنے کے لیے امرتسر تک کیوں آئے؟ ایک طرف دنیاوی ساز و سامان خرید کر منافع کمانا اور دوسری طرف اسے مردار قرار دینا، عجیب قسم کی منطق ہے۔'' والد صاحب: بیٹا! بزرگوں سے بحث کرنا سعادت مندی نہیں، جو کچھ میں نے تمہیں بتایا ہے وہ ایک حدیث کا ترجمہ ہے۔ حدیث کا نام سن کر میں ڈر گیا اور بحث بند کر دی، سفر سے واپس آ کر میں نے گاؤں کے مُلّا سے اپنے شبہات کا اظہار کیا، اس نے بھی وہی جواب دیا، میرے دل میں اس معمے کو حل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی لیکن میرے قلب و نظر پہ تقلید کے پہرے بیٹھے تھے، علم کم تھا اور فہم محدود۔ اس لئے معاملہ الجھتا گیا، میں مسلسل چودہ برس تک حصول علم کے لیے مختلف علماء صوفیاء کے ہاں رہا، درس نظامی کی تکمیل کی، سینکڑوں واعظین کے واعظ سنے، بیسیوں دینی کتابیں پڑھیں اور بالآخر مجھے یقین ہو گیا کہ اسلامِ رائج کا ماحاصل یہ ہے: توحید کا اقرار

اور صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کو بجا آوری، اذان کے بعد ادب سے کلمہ شریف پڑھنا، جمعرات، چہلم، گیارہویں وغیرہ کو باقاعدگی سے ادا کرنا، قرآن کی عبارت پڑھنا، اللہ کے ذکر کو سب سے بڑا عمل سمجھنا، قرآن اور درود کے ختم کرانا، حق ہو کے ورد کرنا، مرشد کی بیعت کرنا، مرادیں مانگنا، مزاروں پر سجدے کرنا، سڑکوں اور بازاروں میں سب کے سامنے ڈھیلا کرنا، تعویذوں کو مشکل کشا سمجھنا، کسی بیماری یا مصیبت سے نجات کے لیے مولوی جی کی دعوت کرنا، گناہ بخشوانے کے لیے قوالی سننا، غیر مسلم کو ناپاک و نجس سمجھنا، طبیعات، ریاضیات، اقتصادیات، تعمیرات وغیرہ کو کفر خیال کرنا، غور و فکر اور اجتہاد و استنباط کو گناہ قرار دینا، صرف کلمہ پڑھ کر بہشت میں پہنچ جانا اور ہر مشکل کا اعلان عمل اور محنت کی بجائے دعاؤں سے کرنا۔ میں علمائے کرام کے فیض سے جب تعلیماتِ اسلامی پر پوری طرح حاوی ہو گیا تو یہ حقیقت واضح ہوئی خدا ہمارا، رسول ہمارا، فرشتے ہمارے، جنت ہماری، حوریں ہماری، زمین ہماری، آسمان ہمارا الغرض سب کچھ کے مالک ہم ہیں اور باقی قومیں اس دنیا میں جھک مارنے آئی ہیں۔ ان کی دولت، عیش اور نعماء محض چند روزہ ہے۔ وہ بہت جلد جہنم کے پست ترین طبقے میں اوندھے پھینک دیئے جائیں گے اور ہم کمخواب و زربفت کے سوٹ پہن کر سرمدی بہاروں میں حوروں کے ساتھ مزے لوٹیں گے۔

''زمانہ گزرتا گیا، انگریزی پڑھنے کے بعد علوم جدیدہ کا مطالعہ کیا، قلب و نظر میں وسعت پیدا ہوئی، اقوام و ملل کی تاریخ پڑھی تو معلوم ہوا مسلمانوں کی 128 سلطنتیں مٹ چکی ہیں، حیرت ہوئی کہ جب اللہ ہمارا اور صرف ہمارا تھا تو اس نے خلافت عباسیہ کا وارث ہلاکو جیسے کافر کو کیوں بنایا؟ ہسپانیہ کے اسلامی تخت پہ فرونیاں کو کیوں بٹھایا؟ مغلیہ کا تاج الزبتھ کے سر پر کیوں رکھ دیا؟ بلغاریہ، ہنگری، رومانیہ، سرویا، پولینڈ، کریمیا، یوکرائین، یونان اور بلغراد سے ہمارے آثار کیوں مٹا دیئے؟ ہمیں فرانس سے بیک بینی دوگوش کیوں نکالا اور تیونس، مراکو، الجزائر اور لیبیا سے ہمیں کیوں رخصت کیا؟ میں رفع حیرت کے لیے مختلف علماء کے پاس گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے اس مسئلے پر پانچ سات برس تک غور و فکر کیا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا، میں ایک دن سحر کو بیدار ہوا، طاق میں قرآن شریف رکھا تھا، میں نے اٹھایا، کھولا اور پہلی آیت جو سامنے آئی وہ یہ تھی، (ترجمہ) کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے ہم ان سے پہلے کتنی اقوام کو تباہ کر چکے ہیں، ہم نے انہیں وہ شان و شوکت عطا کی تھی جو تمہیں نصیب نہیں ہوئی، ہم ان کے کھیتوں پر چھما چھم بارشیں برساتے تھے اور ان کے باغات میں شفاف پانی کی نہریں بہتی تھیں لیکن جب انہوں نے ہماری راہیں چھوڑ دیں تو ہم نے انہیں تباہ کر دیا اور ان کا وارث کسی اور قوم کو بنا دیا۔'' میری آنکھیں کھل گئیں، اندھی تقلید کی وہ تاریک گھٹائیں جو دماغ ماحول پر محیط تھیں یک بیک چھٹنے لگیں اور اللہ کی سنت جاریہ کے تمام گوشے بے حجاب ہونے لگے۔ میں نے قرآن میں جا بجا یہ لکھا دیکھا ''یہ دنیا دار العمل ہے، یہاں صرف عمل سے بیڑے پار ہوتے ہیں، ہر عمل کی جزا و سزا مقرر ہے جسے نہ کوئی دعا ٹال سکتی ہے اور نہ دوا۔''

''وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (53:39) انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے (القرآن)۔ میں سارا قرآن مجید پڑھ گیا اور کہیں بھی محض دعا یا تعویذ کا کوئی صلہ نہ دیکھا، کہیں بھی زبانی خوشامد کا اجر زمردیں محلات، حوروں اور حجوں کی شکل میں نہ پایا، یہاں میرے کانوں نے صرف تلوار کی جھنکار سنی اور میری آنکھوں نے غازیوں کے وہ جھرمٹ دیکھے جو شہادت کی لازوال دولت حاصل کرنے کے لیے جنگ کے بھڑکتے شعلوں میں کود رہے تھے۔ وہ دیوانے دیکھے جو عزم وہمت کا علم ہاتھ میں لیے معانی حیات کی طرف بااندازِ طوفان بڑھ رہے تھے اور وہ پروانے دیکھے جو کسی کے جمالِ جاں افروز پہ رہ رہ کے قربان ہو رہے تھے۔ قرآن مجید کے مطالعے کے بعد مجھے یقین ہو گیا مسلمان ہر جگہ محض اس لیے ذلیل ہو رہا ہے کہ اس نے قرآن کے عمل، محنت اور ہیبت والے اسلام کو ترک کر رکھا ہے۔ وہ اوراد و ادعیہ کے نشے میں مست ہے اور اس کی زندگی کا تمام سرمایہ چند تعویذ ہیں اور بس اور ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ اسلام دو ہیں، ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے اور دوسرا اسلام جس کی تبلیغ ہمارے اسی لاکھ مُلّا قلم اور پھیپھڑوں کا سارا زور لگا کر کر رہے ہیں۔'' (برق کیمبل پور، 25 ستمبر 1949ء)

کیا ڈاکٹر برق واقعی نادم تھے؟

(جاوید چوہدری، روزنامہ ایکسپریس، 28 اپریل 2015ء)

آپ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی زندگی اور ان کے علمی کام کا جائزہ لیجئے، آپ کی زیادہ تر کنفیوژن ختم ہو جائے گی، باقی کنفیوژن کے خاتمے کے لیے میری خدمات حاضر ہیں، ڈاکٹر برق 1901ء میں پیدا ہوئے، خاندان مذہبی بھی تھا اور سید بھی۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار اسلامی دنیا کے ان چند سکالرز میں ہوتا ہے جو مدارس سے نکل کر یونیورسٹی تک پہنچے، وہ عربی زبان میں گولڈ میڈلسٹ تھے اور انگریزی زبان پر اس قدر دسترس رکھتے تھے کہ اپنا تھیسس انگریزی میں لکھا اور آکسفورڈ اور ہارورڈ یونیورسٹی نے پاکستان بننے سے سات سال قبل یعنی 1940ء میں ان کی پی ایچ ڈی کی ڈگری کی تصدیق کی، وہ پاکستان بننے سے قبل ان بیس عالموں میں شمار ہوتے تھے جن کے پاس پی ایچ ڈی کی ڈگری تھی، ڈاکٹر صاحب نے زندگی میں 17 کتابیں اور سینکڑوں مضامین لکھے۔ ''دو اسلام'' ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی پہلی تحقیقی کتاب تھی، یہ کتاب 1949ء میں شائع ہوئی، یہ کتاب اسلامی تاریخ میں طویل مدت بعد نئی تحقیق کی شکل میں سامنے آئی، وہ عالموں کا زمانہ تھا، اس زمانے میں ''دو اسلام'' کے بارے میں دو آراء سامنے آئیں، علماء کرام، صوفیاء کرام اور پڑھے لکھے طبقے نے کتاب کو بے انتہا پسند کیا جبکہ مولوی حضرات، ملاؤں اور جعلی پیروں کی طرف سے اس پر شدید نقطہ چینی ہوئی لیکن اس تنقید کے باوجود یہ کتاب مسلسل شائع ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب کی دوسری تصنیف ''دو قرآن'' تھی، یہ کتاب 1942ء میں برصغیر کے مشہور دینی اور علمی جریدے ''ال

بینات'' میں قسط وار شائع ہوئی۔ ''دوقرآن'' کی اقساط 14 ماہ تک جاری رہیں، یہ اقساط بعدازاں کتاب کی شکل میں شائع ہوئیں، ڈاکٹر صاحب کی تیسری تصنیف ''ایک اسلام'' تھی، یہ کتاب 1952ء کے دوران لکھی گئی اور یہ شائع ہوئی، یہ تینوں کتابیں اسلام کے علمی پہلو پر مبنی تھیں، یہ انسان کو کام پر راغب کرتی تھیں، یہ مسلمانوں کو اللہ کی فلاسفی بتاتی تھیں، ان کتب کا مرکزی نقطہ عمل، کام، سعی اور تحقیق تھا، ڈاکٹر صاحب اہل ایمان کو یہ بتانا چاہتے تھے یہ دنیا اس کی ہے جو محنت کرے گا، آپ کو کھیتوں سے لے کر فیکٹریوں تک اور سکولوں سے لے کر لیبارٹری تک دن رات ایک کرنا ہوگا، آپ تب جا کر زندگی میں آرام اور آسائش پا سکیں گے، اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا رب ہے، یہ ٹام کا بھی اتنا ہی خدا ہے جتنا یہ عبدالرحمن کا ہے، اللہ محنت پسند کرتا ہے، یہ محنت کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا، لوئی پاسچر ہو، نیوٹن ہو، مادام کیوری ہو یا آئن سٹائن ہو یا پھر الخوارزمی، بوعلی سینا اور امام غزالی ہوں دنیا میں جو محنت کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نوازے گا، ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے مسلمان خانقاہوں تک محدود نہ ہوں، یہ وظائف کے ذریعے دنیا مسخر کرنے کی کوشش بھی نہ کریں، یہ محنت کریں، علم حاصل کریں اور اپنی دنیا آپ پیدا کریں، ڈاکٹر صاحب تاریخ اسلام کے نباض تھے، وہ سمجھتے تھے غیر مسلموں کے ہاتھوں مسلمانوں کی 128 ریاستیں تباہ ہوئیں، چنگیز خان، ہلاکو خان اور فرڈی نینڈ نے مسلمانوں کی ایسی ایسی لائبریریاں جلا کر راکھ بنا دیں جن میں صحابہؓ کے ہاتھوں سے لکھے قرآن مجید اور اماموں کے ہاتھوں سے تحریر احادیث کے نسخے تھے، عیسائیوں نے مسجد قرطبہ کو چرچ بنا دیا، ہلاکو خان نے مساجد میں گھوڑے باندھے لیکن مسلمانوں کی مدد کے لیے آندھیاں آئیں، زلزلے اترے اور نہ ہی دشمن کا راستہ روکنے کے لیے سیلاب بھجوائے گئے، ہلاکو خان، چنگیز خان اور فرڈی نینڈ کا دور قطب اور ابدال کا زمانہ تھا، آپ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا زمانہ نکالیں، ان عظیم روحانی شخصیات کے مقابر اس وقت شاد اور آباد تھے، ہلاکو خان نے فروری 1258ء میں بغداد پر حملہ کیا، اس وقت حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے مزار پر سینکڑوں زندہ پیر موجود تھے لیکن مسلمان تمام تر برکات کے باوجود سقوط بغداد سے بچ نہ سکے، خوارزم کی ریاست بچا سکے اور نہ ہی ہندوستان کو ان ظالم حملہ آوروں سے بچا سکے جنہوں نے لاہور سے لے کر دلی تک مسلمانوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، ہم مسلمان اپنی تمام تر روحانی قوت کے باوجود انگریزوں سے ہندوستان بچا سکے، غرناطہ اور نہ ہی خلافتِ عثمانیہ، ہم ساڑھے 13 سو سال مار کھاتے رہے، ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا مسلمانوں کو اسلام کا اصل پیغام سمجھنا ہوگا، انہیں علم، دفاع اور معیشت تینوں پر توجہ دینی چاہیے، انہیں دعا سے قبل کھیت میں ہل جوتنا ہوگا، زمین میں بیج بونا ہوگا اور کھیت کو پانی دینا ہوگا ورنہ دوسری صورت میں صرف دعا سے فصل نہیں اگ سکے گی۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا یہ پیغام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اجنبی تھا، ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طویل عمل

کے ذریعے عملی اسلام سے دور کر دیا گیا تھا اور ہم نے یقین کر لیا تھا اللہ نے دنیا غیر مسلموں اور آخرت مسلمانوں کے لئے وقف کر دی ہے اور ہم اگر آخرت میں سرفراز ہونا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں دنیا میں رسوا ہونا پڑے گا، ہمارے ذہن میں یہ راسخ کر دیا گیا تھا یہ دنیا دنیاوی کتوں کے لیے ہے چنانچہ ہم نے دفاع، علم، تحقیق، انڈسٹری اور معیشت دنیاوی کتوں پر چھوڑ دی اور اپنے لئے ان کتوں کی غلامی پسند کر لی یوں دنیاوی کتے اہل ایمان کے حکمران بن گئے، دنیا مسائل کا حل تلاش کرتی رہی، یہ اینٹی بائیوٹک، گاڑیاں، جہاز، کیڑے مار ادویات اور میزائل بناتی رہی اور ہم وظائف، پھونکوں اور تعویذوں کے ذریعے دشمنوں کی توپوں میں کیڑے پڑنے کا انتظار کرتے رہے، ہمیں یقین دلا دیا گیا تھا، تم صرف عبادت کرو، وظائف اور پھونکیں مارو اور غیروں کو کام کرنے دو چنانچہ پورا عالم اسلام دنیاوی کتوں کا غلام ہو کر رہ گیا، ہم نے اپنی غلامی کو امر ربی بھی بنا لیا تھا، ہم اسے اللہ کا حکم سمجھ کر چپ چاپ بیٹھ گئے تھے، ہم نے اپنے زوال، اپنی غربت اور اپنی مصیبتوں کو روحانیت کی شکل بھی دے دی تھی، ڈاکٹر صاحب کی سوچ سمجھوتے کی غلامی کے جوہڑ میں بھاری بھرکم پتھر ثابت ہوئی اور ملک پاکستان میں ان پر اعتراضات شروع ہو گئے، لوگوں نے دعویٰ کیا ''ڈاکٹر غلام جیلانی برق روحانیت کے خلاف ہیں، یہ احادیث کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔'' یہ پروپیگنڈا غلط تھا کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے زندگی کا بڑا حصہ احادیث پر صرف کیا تھا، یہ سید زادے بھی تھے، ان کے والد کا نام محمد قاسم شاہ تھا، یہ گاؤں لسبال میں امام مسجد بھی تھے اور یہ بیعت بھی کرتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے 1960ء میں روحانیت کی مخالفت کا داغ دھونے کے لیے ''من کی دنیا'' لکھی، یہ کتاب روحانیت کے بارے میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ''من کی دنیا'' میں ان مغربی علماء اور سکالرز کے حوالے دیئے جو مسلمان نہیں تھے لیکن اس کے باوجود اسلام کی روحانیت سے اتفاق کرتے تھے، یہ کتاب 1960ء میں شائع ہوئی۔

آپ اب ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے کام کا جائزہ لیجئے ''دو اسلام'' 1949ء میں شائع ہوئی۔ ''دو قرآن'' 1942ء میں ال بیان میں شائع ہونے لگی۔ ''ایک اسلام'' 1952ء میں شائع ہوئی اور ''من کی دنیا'' 1960ء میں سامنے آئی، ڈاکٹر غلام جیلانی برق 12 مارچ 1985ء تک حیات رہے، ڈاکٹر صاحب 1960ء کے بعد 1985ء تک 25 سال حیات رہے، اس عرصے میں انہوں نے سینکڑوں صفحات پر مشتمل مضامین اور دس کے قریب کتابیں لکھیں، ڈاکٹر صاحب کے انتقال تک ان کی چاروں کتب شائع ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب کی حیات میں ''دو اسلام'' کا آخری ایڈیشن 1981ء میں شائع ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب نے انتقال تک اپنی کسی تحریر، اپنے کسی انٹرویو میں یہ نہیں فرمایا ''میں اپنی سابق کتابوں پر نادم ہوں یا میرا سارا کام دور جاہلیت میں لکھا گیا'' میں چیلنج کرتا ہوں آپ ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب ''من کی دنیا'' یا ان کی 1985ء تک کی تحریروں سے مجھے وہ فقرہ یا نوٹ نکال کر دکھا دیجئے جس میں انہوں نے ''دو اسلام'' ''دو قرآن'' اور ''ایک اسلام'' پر ندامت

کا اظہار کیا ہو یا اسے اپنے دور جاہلیت کا کام قرار دیا ہو، ہم ایک لمحے کے لیے یہ فرض بھی کرلیں ڈاکٹر غلام جیلانی برق 1960ء میں ''من کی دنیا'' لکھتے وقت اپنی ماضی کی کتب پر نادم ہو گئے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب نے من کی دنیا میں اس کا اعتراف کیوں نہیں کیا؟ یہ 1981ء تک اپنی دور جاہلیت کی پیداوار کو شائع کیوں کرواتے رہے؟ ڈاکٹر صاحب اپنے پبلشر کو ایک خط لکھ دیتے اور کتابوں کی اشاعت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتی، ڈاکٹر صاحب اپنے کسی مضمون میں اعتراف جرم کر لیتے۔ یہ اپنی آٹو بائیوگرافی ''میری داستان حیات'' ہی میں اپنی ''جہالت'' کا اعتراف کر لیتے یا اپنے کام، اپنی تحقیق پر عالم اسلام سے معذرت کر لیتے تو آج صورتحال مختلف ہوتی مگر ڈاکٹر صاحب نے ''من کی دنیا'' سے لے کر اپنے آخری مضمون تک کسی جگہ یہ اعتراف نہیں کیا، یہ آخری وقت تک اپنی کتابیں بھی شائع کراتے رہے اور ان کتب کی رائلٹی بھی وصول کرتے رہے لیکن میرے دوست (اور یا مقبول جان) کو اچانک کشف ہوا، ڈاکٹر صاحب 1960ء میں اپنے 1949ء، 1950ء اور 1952ء کے کام پر نادم تھے یا یہ عمر عزیز کے آخر میں اپنے اس کام کو ''دور جاہلیت'' کا کارنامہ قرار دیتے تھے جس نے لسبال کے مولوی غلام جیلانی کو عالم اسلام کا عظیم سکالر ڈاکٹر غلام جیلانی برق بنایا، ایسا سکالر جس کی محفل میں مولانا مدودی سے لے کر ڈاکٹر باقر، ڈاکٹر عبداللہ، شورش کاشمیری، پروفیسر اشفاق علی خان، جنرل عبدالعلی ملک، مولانا زاہد الحسینی، پروفیسر ڈاکٹر اجمل، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر سعادت علی خان، عنایت الٰہی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، حفیظ جالندھری، طفیل ہوشیار پوری، جنرل شریں دل خان نیازی، پروفیسر سعد اللہ کلیم، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شیخ عبدالحکیم، کرنل محمد خان، جنرل شوکت، جنرل شفیق الرحمٰن، احمد ندیم قاسمی اور جسٹس کیانی جیسے علماء ادباء اور استاد بیٹھتے تھے، یہ محفلیں بھی ڈاکٹر صاحب کی آخری سانس تک جاری رہیں، یہ بڑے لوگ تھے اور ڈاکٹر صاحب نے ان میں سے بھی کسی کے سامنے اپنے ''دور جاہلیت'' کے کام پر ندامت کا اظہار نہیں کیا، پھر میرے دوست (اور یا مقبول جان) کو کیسے معلوم ہو گیا؟ میرا خیال ہے یہ میرے دوست کی روحانی طاقت ہے جس نے عالم ارواح میں جھانک کر معلوم کر لیا 1985ء میں انتقال فرمانے والے ڈاکٹر غلام جیلانی برق اپنے کام پر نادم ہیں، میری اپنے دوست سے درخواست ہے آپ اب مہربانی فرما کر علامہ اقبالؒ کی روح سے بھی رابطہ کریں، ہو سکتا ہے علامہ صاحب بھی ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جیسے ترانے پر کف افسوس مل رہے ہوں، آپ اپنی روحانیت کے ذریعے قوم کو گوادر کاشغر روٹ پر قائداعظم کی رائے سے بھی مطلع فرما دیں تاکہ قوم بانی پاکستان کے تازہ ترین خیالات سے مستفید ہو جائے اور اگر ہو سکے تو ملکہ سبا کو بھی اطلاع کر دیں آپ کے یمن پر حوثیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

دو اسلام (مزید)

(جاوید چوہدری، روزنامہ ایکسپریس، 3 اپریل 2015ء)

مسلمانوں سے پہلے دنیا میں دو بڑی مذہبی طاقتیں تھیں، یہودی اور عیسائی۔ یہ دونوں جاہل بھی تھے، ظالم بھی، شدت پسند بھی اور نافرمان بھی۔ یوروشلم کے ربیوں نے جیوری بنا رکھی تھی، یہ جیوری دنیا کی ہر نئی چیز، نئی ایجاد اور نئی سوچ کو خلاف مذہب قرار دے دیتی تھی، جیوری تورات کی کوئی آیت تلاوت کرتی تھی اور نئے خیال، نئی سوچ اور نئی چیز دینے والے کو صلیب پر چڑھا دیا جاتا تھا، یہ لوگ انبیاء تک کو نہیں بخشتے تھے، یہ انہیں آرے سے چیر دیتے تھے اور یہ انہیں غاروں میں بند کر کے بھوکا پیاسا مار دیتے تھے، یہ اس ظلم کا جواز ہمیشہ تورات سے نکالتے تھے، یہ لوگ اس قدر بے لچک، سخت اور تنگ نظر تھے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ پر توہین مذہب کا الزم لگایا اور رومی گورنر کو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھانے پر مجبور کر دیا، آپ عیسائیوں کو بھی دیکھئے، عیسائیت یہودیوں کے جبر، ظلم، عدم برداشت اور جہالت کا ردعمل تھی، یہ لوگ پھانسیاں چڑھتے، صلیبیں اٹھاتے، کوڑے کھاتے اور جیلیں برداشت کرتے ہوئے آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ دنیا کی بڑی مذہبی طاقت بن گئے مگر پھر یہ بھی یوروشلم کے ربی بن گئے اور پوپ نے وہ اختیارات حاصل کر لیے جو یوروشلم کی ربی جیوری کو حاصل تھے، چرچ انیسویں صدی تک اتنا مضبوط تھا کہ یہ عام لوگوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور لباس تک کا فیصلہ کرتا تھا، کافی مسلمانوں کی دریافت تھی، یہ مشروب ایتھوپیا میں دریافت ہوا، مکہ پہنچا، خانہ کعبہ کے سامنے دنیا کی پہلی کافی شاپ بنی اور کافی صوفی ڈرنک یا مسلم ڈرنک مشہور ہوگئی، پوپ نے مسلمانوں کی وجہ سے کافی کو حرام قرار دے دیا، کافی سن 1500ء تک عیسائی دنیا میں حرام اور ممنوعہ رہی یہاں تک کہ 1500ء میں پوپ نے کافی کا پہلا گھونٹ بھرا اور اسے جائز قرار دے دیا، ٹائی مسلمانوں کی ایجاد تھی، یہ قرطبہ شہر میں زریاب قرطبی نے ایجاد کی، خلیفہ کا سٹاف ٹائی باندھتا تھا، پادریوں نے ٹائی پر پابندی لگا دی، یہ ٹائی کو حلال کیسے قرار دیا، یہ بھی الگ کہانی ہے، عیسائی پادری بھی یہودی ربیوں کی طرح نئی ریسرچ، نئی ایجادات اور نئی سوچ کے خلاف تھے، یہ بھی انجیل کی آیات کی تلاوت کرتے تھے، آیات کی اپنی مرضی کی تاویل بیان کرتے تھے اور سائنس دانوں کو پھانسی چڑھا دیتے تھے، آپ اس ضمن میں نکولس کوپرنیکس کی مثال لیجئے، کوپرنیکس علم ہیئت اور ریاضی کا ماہر تھا، اس نے 1520ء میں سورج اور زمین کے رشتے پر کتاب لکھی، اس نے کتاب میں انکشاف کیا ''زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے'' وہ چرچ کے اختیارات سے واقف تھا چنانچہ اس نے کتاب پر اپنا نام نہیں لکھا، پادریوں نے کتاب کو خلاف مذہب قرار دے دیا، پادریوں کا کہنا تھا انجیل میں لکھا ہے سورج زمین کے گرد گھومتا ہے چنانچہ یہ نئی تھیوری انجیل سے متصادم ہے، مصنف کے خلاف سزائے موت کا حکم آ گیا، چرچ کوپرنیکس سے بائیس سال یہ پوچھتا رہا ''یہ کتاب تم نے لکھی'' اور کوپرنیکس انکار کرتا رہا یہاں تک کہ 1543ء میں جب اس کی موت کا وقت آ گیا تو اس نے اپنا جرم بھی مان لیا اور کتاب پر اپنا نام بھی تحریر کر دیا، چرچ نے کتاب ''بین'' کر دی، فلورنس کے سائنس دان گیلیلیو نے 1632ء میں انکشاف کیا ''صرف زمین نہیں بلکہ باقی سیارے بھی سورج کے گرد گھوم رہے ہیں'' چرچ نے گیلیلیو کو بھی کافر قرار دے دیا، گیلیلیو کی کتاب بھی ضبط ہوئی، آٹھ ماہ

مقدمہ چلا اور آخر میں گیلیلیو کو ''موت یا معافی'' کا آپشن دیا گیا۔ گیلیلیو اپنی تھیوری سے تائب ہوا اور چرچ سے معافی مانگ لی، پادریوں نے اسے اس کے فارم ہاؤس میں نظر بند کر دیا، وہ 1642ء میں اس فارم ہاؤس میں فوت ہو گیا مگر اس کا جرم معاف نہ ہوا، پادریوں نے اس کے جنازے کی اجازت نہ دی یوں گیلیلیو کو جنازے کے بغیر گم نام قبر میں دفن کر دیا گیا، اس واقعے کے ساڑھے تین سو سال بعد پوپ جان پال نے 1992ء میں اعتراف کیا ''گیلیلیو کے ساتھ ناانصافی ہوئی'' گیلیلیو کے بعد گیارڈانو برونو (Giordano Bruno) نے زمین کی ساخت پر کام شروع کیا، چرچ کے حکم پر لوگوں نے اسے زندہ جلا دیا، آپ اگر کبھی آکسفورڈ جائیں تو آپ کو وہاں بشپ نکولس ریڈلی اور بشپ ہیوگ لی مڑکی یادگار ملے گی، یہ دونوں چرچ کے روایتی طریقہ کار سے اختلاف رکھتے تھے چنانچہ دونوں کو آکسفورڈ کے چوک میں زندہ جلا دیا گیا، یہ عیسائیوں کا علم، سائنس اور جدت کے بارے میں رویہ تھا، یہ چند مثالیں ہیں، تاریخ ایسے سینکڑوں واقعات سے بھری پڑی ہے۔

اسلام یہودیت اور عیسائیت سے بالکل برعکس تھا، یہ روشن خیال بھی تھا، یہ کھلا ڈھلا بھی تھا، یہ نئے اور جدید خیالات کو قبول بھی کرتا تھا، یہ علم دوست بھی تھا، یہ عملی بھی تھا اور یہ برداشت بھی رکھتا تھا، اسلام کا دل کتنا بڑا تھا؟ آپ اس کا اندازہ یوروشلم کی فتح سے لگا لیجئے، حضرت عمر فاروقؓ یوروشلم کی فتح پر بیت المقدس گئے اور آپؓ نے چرچ میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا، آپؓ کا کہنا تھا، میں نے اگر ایک چرچ میں نماز پڑھ لی تو مسلمان تمام کلیساؤں کو مسجدیں بنا دیں گے، مسلمانوں نے سینکڑوں سائنسدان، فلسفی اور فقیہہ پیدا کئے، محمد ابن موسیٰ الخوارزمی نے 810ء سے 820ء کے درمیان الجبرا کی بنیاد رکھی، ثابت بن قراء نے 880ء میں شماریات (Statistics) کا علم متعارف کرایا، ابن الہیثم نے 1010ء میں روشنی اور علم بصارت پر کام کیا، یونانی فلاسفر اور مذہب یہ کہتا تھا ہماری آنکھ میں روشنی (نور) ہوتی ہے، یہ روشنی آنکھ سے نکل کر اشیاء پر پڑتی ہے، ابن الہیثم نے یہ فلسفہ مسترد کر دیا، اس نے ثابت کیا روشنی باہر سے ہماری آنکھوں میں داخل ہوتی ہے، ہماری آنکھ سے پیچھے پردہ ہے جس پر تمام مناظر منعکس ہوتے ہیں، ابن الہیثم نے ہزار سال قبل ''کتاب المناظر'' کے نام سے کتاب لکھی، ابن الہیثم کے اس فلسفے پر بعد ازاں کیمرہ ایجاد ہوا، عینک بنی اور آنکھوں کا علاج شروع ہوا، ابوریحان البیرونی نے 1020ء میں ریاضی، تاریخ اور جغرافیہ پر کام کیا، اس نے زاویے کو تین برابر حصوں میں تقسیم کیا اور زمین کا محیط نکالنے کا طریقہ ایجاد کیا، ابوالقاسم الظواہری نے 980ء میں زخم بھرنے اور سرجری کے جدید علم کی بنیاد رکھی، اس نے ادویات کا پہلا انسائیکلوپیڈیا بھی مرتب کیا، امام غزالیؒ پہلے مسلم مفکر تھے جنہوں نے دنیا کو بجٹ کا تصور دیا۔ بوعلی سینا نے گیارہویں صدی عیسوی میں طب کی بنیاد رکھی اور کتاب الشفاء کے نام سے طب پر حیرت انگیز کتاب لکھی، یہ 18 جلدوں پر مشتمل تھی اور امیر تیمور کے پوتے الغ بیگ نے 1429ء میں سمرقند میں دنیا کی پہلی جدید ترین رصد گاہ تعمیر کرائی، اس نے سورج کے گرد زمین کے چکر کا دورانیہ نکالا، یہ سب نئے علوم تھے، یہ تمام فلسفے نئی سوچ تھے، یہ سائنس کی بنیاد تھے اور یہ مسلمان مفکرین سائنس کے ان علوم

کے بانی تھے جن کی چوٹی پر آج یورپ کی ساری ترقی بیٹھی ہے، مسلمان فقہ کے علم کے بھی بانی تھے، اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس نے اجتہاد کی بنیاد رکھی، اجتہاد اتنا بڑا علم، اتنی بڑی عدالت تھا کہ اس کے ذریعے حضرت عمر فاروقؓ نے مصیبت کے زمانے میں چوری کی وہ سزا تک معطل کر دی جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا تھا، یہ سب مسلمانوں کا کمال تھا اور ان کے کمالات کے دوران کسی شخص، کسی مسلم ریاست نے بوعلی سینا کے خلاف مقدمہ درج کیا، امام غزالیؒ کو پتھر مارے اور نہ ہی البیرونی، ابن الہیثم، ثابت بن قراء اور الخوارزمی کو زندہ جلایا، اسلامی معاشرے نے نہ صرف ان تمام سکالرز کو تسلیم کیا بلکہ مسلمان آج تک ان پر فخر بھی کرتے ہیں۔ آپ کسی دن ٹھنڈے دماغ سے یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی فکری، سائنسی اور نظریاتی تاریخ کا مطالعہ کریں، آپ اسلام کو دنیا کا جدید ترین، وسیع القلب اور سائنسی مذہب پائیں گے، ایک ایسا مذہب جو فتح مکہ کے بعد ابوسفیان اور ہندہ تک کو معاف کر دیتا ہے، جو جھوٹے نبی مسیلمہ کذاب کے پیروکاروں کو بھی قتل نہیں کرتا اور جو یونان کے فلسفیوں اور شام کے عیسائیوں سے معاشرت کا سبق سیکھتے ہوئے نہیں ہچکچاتا، آپ مذہبی اور معاشرتی تاریخ کا تھوڑا سا مطالعہ کریں گے، آپ یہ جان کر حیران رہ جائیں گے ہم جہاں سن 1000 میں تھے، یہودی اور عیسائی آج وہاں ہیں، یہ آج البیرونی، ابن الہیثم، بوعلی سینا اور غزالیؒ کے گھٹنوں کو چھو رہے ہیں اور جہاں یہودی اور عیسائی صلیب کے واقعے سے سن 1600ء تک تھے ہم آج وہاں کھڑے ہیں، یہودی اور عیسائی آج ثابت بن قراء کو علم کا محسن قرار دے رہے ہیں جبکہ ہم مسلمان اسلامی معاشرے میں نئی بات کرنے والوں، سائنس، ٹیکنالوجی اور علم کی بات کرنے والوں اور برداشت اور تحقیق کی بات کرنے والوں کے ساتھ وہ سلوک کر رہے ہیں جو کبھی پادریوں نے گیلیلیو، کوپرنیکس اور برونو کے ساتھ کیا تھا، آپ تاریخ کا المیہ دیکھئے آج 2015ء میں یہودی اور عیسائی علم، ٹیکنالوجی اور معیشت میں ''مسلمان'' ہو چکے ہیں جبکہ ہم مسلمان سفر طے کرتے کرتے معیشت، ٹیکنالوجی اور علم میں وہاں پہنچ گئے ہیں جہاں پانچ سو، ہزار اور دو ہزار سال پہلے عیسائی اور یہودی تھے، یہ آگے دوڑ رہے ہیں اور ہم نے پیچھے کی طرف دوڑ لگا رکھی ہے۔

میں سمجھتا ہوں اسلام دو ہیں، ایک وہ اسلام جو خلفائے راشدین کا اسلام تھا، جو الخوارزمی، ابن سینا، البیرونی، امام غزالیؒ، ابن الہیثم، ابن خلدون، ابن کثیر، ابن تیمیہ اور ثابت بن قراء کا اسلام تھا اور دوسرا وہ اسلام جو داعش کا اسلام ہے، ایسا اسلام جو اپنے علاوہ دوسرے مسلمانوں کو بھی مسلمان نہیں سمجھتا، جس میں شیعہ سُنیوں کو کافر سمجھتے ہیں اور سنی شیعوں کو اور جس میں وہابی کی جنت اور ہے اور بریلوی کی بہشت دوسری اور میں درمیان میں کنفیوز کھڑا ہوں، میں لوگوں سے پوچھ رہا ہوں کس اسلام کی طرف جاؤں، میں کسے اپنا مذہب مانوں۔

باب المراسلات

محترم سرسید احمد خان پر لگائے گئے الزامات کا جائزہ

ان دِنوں محترم سرسید احمد خاں کی شخصیت کو مُتنازع بنانے کی فیس بک میں کاوشیں سامنے لائی جارہی ہیں۔

محترم سرسید احمد پر لگائے گئے الزامات کا جائزہ:

اُن پر مغرب کی سوچ کو قرآن کے الفاظ کے تواتر سے بیان کئے معانی سے انحراف کرنے اور اُمت مُسلمہ کے اُن پر کُفر کے مُتفقہ فتوٰی کا چرچا کیا جارہا ہے۔

اُن کے موقف کے رد میں یہ بھی ظاہر کیا جارہا ہے کہ عُلمائے کرام کی کاوشوں سے اُن کا نظریہ کہیں بھی پنپ نہیں سکا۔ وہ لوگ یہ بھی دعوٰی کررہے ہیں کہ سرسید احمد خاں کے موقف کی کسی بھی مذہبی حلقے سے اور اُن کے مُتبعین سے بھی تائید و پزیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

سرسید احمد خاں کے ''مُتبعین'' میں سب سے زیادہ وہ محترم پرویز صاحب کی شخصیت کے ذکر کو اولیت دیتے ہیں۔اِس متابعت کی دلیل میں وہ مماثلت کی تلاش میں محترم پرویز صاحب کو بھی مغرب کی سوچ کی نمائندگی کرنے، قرآنی الفاظ کے من پسند معانی اخذ کرنے اور مُتفقہ طور پر کُفر کا فتوٰی صادر ہونے پر اُمت مُسلمہ سے خارج ہونا شامل قرار دیتے ہیں۔اسی مماثلت میں سب سے بڑی وجہ دونوں کو مُنکرِ حدیث اور اس کے نتیجہ میں مُنکرِ سنت قرار دے کر اُمت کے قابلِ قبول فرقوں سے علیحدہ فرقہ کا نام دے کر اسلام سے خارج کیا گیا ہے۔اس ضمن میں عُلماء کی جانب سے جو فتوٰی محترم پرویز صاحب پر لگایا گیا، اُس کی بنیادی وجہ کا متن یوں دیا گیا کہ ''مُحترم پرویز صاحب نے ایک مستقل فرقہ اپنے عقائد کی بنا پر قائم کرلیا ہے۔اور اب کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ قرآن کریم کی نئی تعبیر کرے یا ضروریاتِ دین، اللہ، رسول، آخرت، جنت و دوزخ، ملائکہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی کوئی نئی تشریح کر کے ان میں کوئی تحریف کرے یا ان کی کوئی ایسی مراد بیان کرے جو اس کے اُمت کے اجماع اور چودہ سالہ تعامل و توارث کے خلاف ہو۔

یہی اور اسی قسم کے الزامات سرسید احمد خاں جیسی نظریہ پاکستان کے معمارِ اوّل کی شخصیت پر لگا کر اُن پر کُفر و مرتد ہونے کا نہ صرف فتوٰی صادر کیا بلکہ مفتی اعظم مکہ سے اُن کے واجبِ القتل کا فتوٰی بھی حاصل کر کے اُن کی خوب تشہیر کی۔ دونوں حضرات کے فرقہ کا نام رکھنے میں دشواری کو اس طرح دور کیا کہ سرسید احمد خاں نیچر کا نام استعمال کرتے تھے، لہٰذا اس وجہ سے اُن کو ''نیچری'' اور محترم پرویز صاحب کے نام کی نسبت سے اُنہیں ''پرویزی'' فرقہ کے کھاتے میں ڈال دیا اور یوں چھوٹی سی ''ی'' سے اُنہوں نے مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالا۔

اب ہم عُلمائے کرام کے اس دعوٰی کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس میں دعوٰی کیا گیا ہے کہ سرسید احمد خاں کے اختلافی نظریات کو اُن کے بعد، جس میں خصوصی طور پر پرویز صاحب بھی شامل ہیں، پزیرائی اور تائید حاصل نہیں ہو سکی۔ ہم دوسروں کی آراء سے تو پوری واقفیت نہیں رکھتے لیکن محترم پرویز صاحب کے حوالہ سے اُن کے دعاوی صحیح نہیں ہیں۔

دیکھا گیا ہے کہ ہماری قوم بدقسمتی سے شخصیات کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور ان سے منسوب مختلف فرقوں میں تقسیم ہو کر اپنے آپ کو حق پر اور دوسروں کو باطل پر سمجھتی ہے۔ دونوں اصحاب محترم سرسید احمد خاں اور محترم پرویز صاحب نے نہ کوئی اپنا نظریہ پیش کیا ہے اور نہ ہی فرقہ بنایا ہے۔ انہوں نے جو کچھ قرآن میں پایا اس کو حق سمجھتے ہوئے آگے بڑھا دیا۔ لہٰذا ان پر تنقید صرف ان کے فہم قرآن کے تناظر میں ہو سکتی ہے نہ کہ بطور فرقہ کہ جس کا وجود مکتبِ مُلا کے اذہان میں پایا جاتا ہے۔

اس ضمن میں ہم محترم پرویز صاحب کے حوالہ سے اعلان کر سکتے ہیں کہ وہ سرسید احمد خاں کے ماسوائے چند ایک کے اُن کے سبھی نظریات کی اپنی تحریروں میں تائید کرتے ہوئے ہی پائے گئے ہیں۔ اسی تائید کے حوالہ سے اُن کی تفسیر القرآن سے انتخاب کرتے ہوئے بیس اہم اختلافی نظریات کی نشاندھی یوں کی جا سکتی ہے۔

1۔ قرآن مجید میں کوئی امر ایسا نہیں ہے، جو قانونِ فطرت کے برخلاف ہو۔ علانیہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے امر کے واقعہ ہونے کا ثبوت نہیں ہے جو مافوق الفطرت ہو اور جس کو تم معجزہ کہتے ہو۔ جن آیاتِ قرآنی سے لوگ معجزاتِ مافوق الفطرت پر استدلال فرماتے ہیں، اُن سے ہم عرض کریں گے کہ آیا اُس کے کوئی دوسرے معنی بھی ایسے ہیں جو موافق زبانِ کلامِ عرب کے اور موافق محاورات، استعمالات اور استعاراتِ قرآن مجید ہو سکتے ہیں۔ اگر نہ ہو سکتے ہوں، تو ہم قبول کریں گے کہ ہمارا یہ اصول غلط ہے۔ اگر ہو سکتے ہوں تو آپ اس بات کو ثابت نہیں کر سکتے کہ قرآن مجید میں معجزاتِ مافوق الفطرت موجود ہیں۔

ہمارے نزدیک خدا بموجب اپنے وعدہ کے سب کام اُس قانونِ قدرت کے مطابق کرتا ہے، جو اُس نے بنایا ہے۔ اُس وعدہ اور قانونِ فطرت میں جب تک کہ وہ قانونِ فطرت قائم ہے، تخلف محال ہے۔ اگر ایسا ہو تو ذاتِ باری کی صفاتِ کاملہ میں نقصان لازم ہے۔ ہمارے نزدیک کلمات اللہ اور خلق اللہ دو مرادف الفاظ ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ فطرت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

2۔ قرآن مجید جس قدر نازل ہوا ہے، بتمامہٖ موجود ہے۔ نہ اس میں ایک حرف کم نہ زیادہ ہوا ہے۔ ہر ایک سورہ کی آیات میرے نزدیک منصوص ہیں۔ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ نہیں ہے۔ یعنی اس کی کوئی آیت کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوئی۔

3۔ تفسیر کو مخالفانہ اور غیر معتقدانہ طور پر دیکھیں اور اس کی ایک ایک بات پر بھی یقین نہ کریں۔ سب کو غلط سمجھیں مگر اُس کو دیکھیں اور غور سے پڑھیں۔

4۔ جیسا تم کو کسی معنی کے حقیقی یا لغوی معنی لینے کا حق ہے، ویسا ہی مجھ کو اُسکے مجازی معنی لینے یا استعارہ اور کنایہ از قسم خطابیات قرار دینے کا حق ہے۔

5۔ فروع ہمیشہ متفرع ہیں کسی اصول پر، اور یہی اصول فروع کی دلیلِ قاطع اور برہانِ قطعی ہوتے ہیں۔

6۔ قرآن پر بحث سے پہلے اصولِ تفسیر پر ایک موقف پر پہنچنا لازم ہے ورنہ یہ بحث مناظرانہ بحث برائے بحث رہ جاتی ہے۔

7۔ ہم کو لازم ہے کہ صرف الفاظِ قرآن کے پابند ہوں نہ کہ اُن قصوں کے جو یہود و نصاریٰ میں مذکور ہیں۔

8۔ کوئی کلام بجز قرآن مجید کے ایسا نہیں ہے کہ وہ جاہل اور اُمی محض کو بھی اُس نتیجہ پر پہنچا دے، جس نتیجہ پر ایک عالم فلسفی کو پہنچاتا ہے۔ قرآن کا طرزِ بیان ہر ایک کے مذاق اور دماغ کے موافق ہے۔

9۔ حصولِ مطلب کے جو اسباب خدا نے مقرر کئے ہیں، وہ مطلب تو اُنہی اسباب کو جمع کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ مگر دعا نہ اُس مطلب کے اسباب میں سے ہے اور نہ اُس مطلب کے اسباب کو جمع کرنے والی ہے۔ دعا کے ساتھ ہی کبھی مطلب کا حاصل ہوجانا اتفاقیہ بات ہے، جو اُس کے اسباب جمع ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔

10۔ اشیاء کا بعینہٖ بہشت میں موجود ہونا نہیں ہے بجز اس کے کہ جہاں تک انسان کی عقل وطبعیت کے موافق اعلیٰ درجہ کی راحت کا خیال پیدا ہو سکے وہ پیدا ہو۔

11۔ قرآن سے فرشتوں کا ایسا وجود جیسا کہ مسلمانوں نے اعتقاد کر رکھا ہے، ثابت نہیں ہوتا۔

12۔ تمام محققین متفق ہیں کہ انہی قوٰی کو جو انسان میں ہیں، اور جن کو نفسِ امارہ یا قوٰی بہیمیہ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی شیطان ہے۔

13۔ آدم کے لفظ سے وہ ذات خاص مراد نہیں ہے جس کو عوام اُلناس اور مسجد کے مُلا باوا آدم کہتے ہیں، بلکہ اُس سے نوعِ انسانی مراد ہے۔

14۔ ''مذہب'' انسان کے لیے بنایا گیا ہے نہ کہ انسان ''مذہب'' کے لیے۔

15۔ اسلام کے احکام ایک ایسے عام قاعدہ پر صادر ہوتے ہیں، جو قریباً سبھی (تمام) افراد کے مناسبِ احوال ہیں۔

16۔ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ وصیت کرنے والے کے مرنے کے بعد اُسی طرح عمل کیا جائے جس طرح اُس نے اپنی زندگی میں مقرر کر دیا ہے۔

17۔ جو لوگ بمشکل روزہ رکھنے کے قابل ہوں، اُن کو قرآن میں اجازت دی گئی ہے کہ روزوں کے نعم البدل میں فدیہ دیں۔

18۔ خلافِ قانونِ قدرت کو یہ کہ دینا کہ خدا میں سب قدرت ہے، اُس نے ایسا ہی کر دیا ہوگا، ناسمجھ بلکہ مرفوع القلم لوگوں کا کلام ہے۔

19۔ انسان کو جب خدا نے مکلّف بنایا تو اُس فطرت کا بھی جس سے وہ مکلّف ہو سکے، عطا کرنا عین انصاف ہے۔

20۔ مشرکینِ عرب (اپنی زبان سے) جنوں کو مخفی رہنے والے جانتے تھے۔

سر سید احمد خاں کے درجِ بالا اہم قرآنی اصطلاحات کے اختلافی موقف کی محترم پرویز صاحب کی طرف سے تائید سے عُلمائے کرام کے دعاوی کی تردید ہو جاتی ہے۔ جہاں تک احادیث کے بارے میں ان دونوں حضرات کا موقف ہے، وہ طلوعِ اسلام کے ایک بنیادی تصور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس میں دونوں کم وبیش مُختلف پیرائے میں یکساں ہے۔

''نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ، شرف وعظمتِ انسانیت کی معراج کُبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ حضورِ کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے، اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن کریم کے باہر ہے سو اس میں کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ کی سیرت پر طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ غلط ہے۔ اسے رسول کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ یہی اصول صحابہ کبار کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلے میں سامنے رکھنا چاہیے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، ہم ہر اُس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس میں حضور اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو''

سر سید احمد خاں کو مُنکر حدیث ہونے کے اعلان میں عُلمائے کرام یہ بھی بھول گئے کہ ولیم میور کی تصنیف سے رسول اکرمؐ کی شخصیت پر لگے ہوئے داغ دھونے کے لئے قرض لے کر اور سب کُچھ چھوڑ کر وہ لندن چلے گئے۔ وہاں اُنہوں نے پبلک لائبریری میں برسوں وقت صرف کر کے رسولِ اکرم کی پاکیزہ اور منزّہ سیرت کو سامنے لاتے ہوئے سر ولیم میور کی تصنیف کا رد لکھ کر سکھ کا سانس لیا۔

اِسی طرح اُنہوں نے محترم پرویز صاحب کی پُکار پر کان دھرنے کی ضرورت محسوس نہ کی جس میں وہ برملا اظہار کرتے دکھائی دئے کہ ''میں کبھی کبھی قرآن کی تفسیر میں اختلافات دیکھ کر خود قرآن کے اللہ کے کلام ہونے پر شک میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ جس چیز نے مجھے اندھیروں میں جانے سے روکا وہ حضور اکرم ﷺ کی شخصیت تھی۔ میرا یقینِ کامل تھا کہ حضور جیسی پاکیزہ شخصیت جھوٹ نہیں بول سکتی۔ وہ اگر یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم الہہ کا کلام ہے تو خدا کی قسم ایسا ہی ہے۔ مُجھ ہی سے سمجھنے میں کوتاہی ہو رہی ہے۔''

مَیں اپنے فیس بک فرینڈز کے سامنے دوبارہ عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں ان سبھی عُلمائے کرام اور مُفتیانِ عظام کے نام سے کہلائے جانے والے اشخاص سے فتوٰی دینے کے اختیار کو واپس لینے کا حکومتِ وقت سے مطالبہ کرنا چاہیے۔

اسلام- مذہب نہیں دین ہے۔

یعنی نظامِ حیات جو ایک آزاد مملکت میں پروان چڑھتا ہے۔

اس نظام کی تشکیل کا آغاز عہد نبوی میں ہوا لیکن وہ اپنے عہد شباب تک

خلافتِ فاروقیؓ

میں پہنچا۔ اسلام کو بحیثیت ایک نظامِ حیات دیکھنے کے لیے اُس عہد کی صحیح تصور کا سامنے
آنا ضروری ہے۔ اسے پرویز صاحب نے اپنی مدت العمر کی تحقیق وکاوش کے بعد اپنی

شاہکارِ رسالتؐ

میں پیش کیا ہے۔ اس کے آخری باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ

عہدِ فاروقیؓ کے بعد اِسلام پر کیا گزری؟

اور کس طرح دین سے موجودہ مذہب میں تبدیل ہوگیا۔

اس کتاب نے ہماری فکری دُنیا میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج

طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہوذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی وملائی وپیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰتِ) –Durus-al-Qur'an Parah 30: Chapter 7

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is June 29, 1984, the last Friday of Ramadan; and today's lecture starts with verse 31 of Surah *Al-Naziat* (النّٰزِعٰتِ) (79:31).

Summary of last lecture

If you remember, the last lecture was mainly focused on the verse: وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا (79:30). And I had mentioned the work of French researcher Dr. Maurice Bucaille and his explanation of دَحٰهَا (79:30) and كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (21:30); and how he, in complete amazement and ecstasy, called on the scientists of the world to ponder on this fact: "how could human mind say these things 1400 hundred years ago when modern science has discovered them only recently? What conclusion do you derive from this? As for myself I have concluded that the Quran cannot be the work of any human being." Allah says in the Quran that this is a book for: لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (10:5) – people of knowledge; لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (2:164) – people who use their reason; لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (13:3) – people who think! [Asad].Dr. Bucaille stopped at every verse and pondered deeply on their meanings. But how did he come to the Quran?

When he originally started his journey he soon got disappointed with Bible about what it has to say about the Universe and its creation. But, then, he thought about Islam as being one of the largest religions of the world; and he wanted to know what its religious book, the Quran, had to say on this matter. After investigating this topic in the Quran, he was surprised to find out that the Quran matches 100% with modern scientific data regarding the Universe and its creation and the workings of its heavenly objects. Then he asked the scientists: Please tell me how could a person tell these things 1400 years ago no matter how knowledgeable and intellectual that person may be?

Everything is based on imitation (تقلید *Taqleed*) with us

My dear friends! Whatever has come down to us in the name of Islam there is no room in it for knowledge and intellect. Everything happens in it by imitation or تقلید (*Taqleed*). Since we are talking about this let me mention few things here.

You may have heard debates about imitators or *Muqallid*(مقلد) and anti-imitators (غیر مقلد). These are two sects of Muslims. But anti-imitators (غیر مقلد) are also imitators (مقلد) except that they are followers of the Imams of collectors of hadiths rather than followers of the Imams of *Fiqh* (Jurisprudence) who proudly call themselves imitators (مقلد). So, in reality, they are both imitators (مقلد) – of human beings. Although the collectors of hadith never said that these *are* the sayings of the Prophet (PBUH) but they did say that these are *attributed* to him. The collectors of hadiths filtered their own versions from among a large collection; and emphasized that this was their best educated *guess* that the Prophet (PBUH) may have said this. In spite of this, the followers of hadiths vehemently insist that *the seare* the sayings of the Prophet (PBUH).Whatever may be the case, the bottom line is this: both these groups' final authorities are human beings. And when that happens there is no possibility of creativity; there is no possibility of original research; there is no possibility of *Ijtihad*; there is no room for knowledge and intellect. Followers of these Imams therefore just stand stuck at one place like a tucked-up stone. This is called جَحِيم (*Jaheem*) by the Quran. Whenever some issue comes up each group runs to its own Imam's book for its guidance. While Muslims are stuck in thousand year old books of Imams which no one can dare to criticize or change, human knowledge has advanced to greater and greater heights since the time these books were written. No matter how knowledgeable those Imams were of their time, the fact is that they wrote these books more than thousand years ago. It is sad that while knowledge has advanced so much Muslims are stuck with what these Imams wrote; and all the different sects of Muslims consider their own sectarian books as sacrosanct and the final word in Islam. However, this is not the way to progress in the field of knowledge, nor it is the way to raise a peoples' thinking level; nor it is the way to *understand* the meaning of the Quran.

Dr. Bucaille has devoted one chapter of his book to explain دَحٰهَا (79:30). Then he takes up the next verse: اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰهَا (79:31). The simple translation of this verse is: and has caused its waters to come out of it, and its pastures. Now this meaning looks pretty straightforward and seems there is nothing much deeper here that requires us to stop and think. But thinkers like Dr. Maurice Bucaille don't just move on. He stopped and started thinking why the Quran in this verse says:مَآءَهَا (*Maa-a-haa*) instead of simply مَآ (*Maa-a*). Why the هَا (*Haa*)? Dr.

Bucaille stopped and started thinking about it: the water which is there is the result of a cyclic order through a giant system of water works.Sun's rays falling on the water – of oceans, and of lakes and rivers etc. – causes the surface water to evaporate and rise above in the atmosphere and to become clouds. The winds carry these clouds all over the Earth; and when water vapors condense due to cold temperature in the upper atmosphere and turn into water drops then these water drops come down to earth in the form of rain. The water from the rain then goes into rivers and oceans, and the cycle repeats itself. This is why the Quran has called this as "مَآءَهَا" and that is why Dr. Bucaille stopped at the ءَهَا in verse (79:31) and started pondering at this huge global natural system of waterworks.

My dear friends! Dr. Bucaille goes on to say that originally the Earth was a giant spinning fireball; sow here from the water came? Such a fireball and from within it came water?! The research shows that the Earth went through different periods in its formation – which the Quran calls "یوم" or period – and water did not come from somewhere else. So the question is: what changes took place in the Earth that produced water? To answer this Dr. Bucaille focused on the "ءَهَا" of "مَآءَهَا". We may not even think that this "ءَهَا" is something worth thinking about but Dr. Bucaille pondered on this and found out that this water does not come from somewhere outside but it comes from out of Earth itself and returns to Earth in the form of rain. Well, these people are not imitators or *Muqallid* (مقلد) like us but are original thinkers. Dr. Bucaille has devoted one chapter of his book on water where he explains its origin and its cyclic order.

My dear friends! Our lectures have very limited time. But the Quran invites thinkers and researchers of all disciplines to ponder deeply on His signs in the outer Universe and on His signs in the human-self. Only then will we be able to understand the realities hidden within them. That is what Dr. Maurice Bucaille did; and presented his research findings in his book. The next word in this verse (79:31) is وَمَرْعٰهَا – and its pastures for humans as well as for cattle. The details of this we will discuss little later. But let us take the next verse: وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (79:32) – and has made the mountains firm.

Choice of words in the Quran

My dear friends! I have mentioned many times that every word of the Quran is a miracle but there are hundreds or even thousands of words in Arabic language for the same thing. Normally they are called synonyms. But the Arabs think that it is a defect of language to have two words for exactly the same thing. In his book, *Cosmic Consciousness*, Bucke says that although Arabic language has hundreds or even thousands of words for the same thing but there is a difference in shades in the meaning of one word compared to another. We need to ponder why the Quran selected one word from among the many synonyms in a particular verse. In poetry it is the case that to maintain rhythm a poet chooses one synonym over another. But this is not the case in Arabic language of the Quran. No other word can take the place of a word in the Quran. The Quran is neither prose nor poetry. Arabs did not know what to call the Quran's style. The Quran does not remain Quran if one replaces any of its word with its synonym. This is tantamount to Shirk and will change its uniqueness – and then it will no longer remain Allah's book.

My dear friends! In the verse (79:32) what to say of the word اَرۡسٰهَا! – We use "رسا or مرسا" when a ship is anchored. Why is this word being used here by the Quran? It needs some explanation. There is this verse after few verses where the word "مُرۡسٰهَا" has come: يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰهَا (79:42) – They ask thee of the Hour: when will it come to port? [Pickthall]. The ship floats on the surface of water and stops at a port. According to modern research this Earth and other planets float in their orbits but we see that the mountains stay firmly at one place and work as anchor. It has been well known that the mountains store fresh water in the form of snow and feed the rivers during summer. But what roles do they play in stabilizing the Earth and in regulating its climate have only recently been investigated. For example:

> Mountains play a vital role in the subsistence of organisms including man, animal and plants. There are mountains in a chain called ranges that are thickly forested and serve as a sanctuary for a diverse variety of living organisms. The organisms are

often inter-dependent on each other for their subsistence. That is the ecological importance of mountains to living things. Trees and vegetation growth provide shelter and food for many species. Another role mountains play is that they serve as protection from harsh weather conditions or winds of gale force. During heavy rains or snowstorm, the gullies serve as drainage for the water flow to lower areas surrounding it that irrigates vegetation. With the flow of water, many minerals go along with it that helps improve growth of plants. The rivers or streams help also to keep constant supply of fresh water to lakes and other inland bodies of water. The flow alone of water from the mountains thus shows its ecological importance to virtually all its inhabitants and those in the plains or flat lands. That is not to mention fresh water creatures. Bio-diversity in mountains that are forested and untouched by man is one of nature's ways in providing balance on the earth's atmosphere. Mountains are the "shock-absorbers" of pollution created by man while it sustains life within its forests. The ecological importance of mountains encompasses all organisms within its vicinity and even far reaching to the seas and oceans. Most rivers that originate from mountains empty into oceans and seas. Even volcanic mountains provide or contribute to the balance of nature. Changes in the environment in populated areas can actually be neutralized by nearby mountains that have bio-diversity. This means that mountains that have been mined or deforested near urban areas could no longer have any ecological importance to nature. Deforested mountains can no longer sustain life for most of the organisms that once inhabited them. A significant ecological importance of mountains that are thickly forested is being a source of extracts that are often discovered to produce substances used for medical purposes. An example will be the sera or anti-venom that can be extracted from snakes that are lifesaving. The same could be said for plant extracts found only in the wild that can be used to treat diseases. Whatever can be taken in minute quantities from preserved mountains proves their ecological importance globally. The distance of virgin mountains does not matter because the benefit it provides to nature does not stay only within its confines. As long as mountains maintain their natural resources, it will be able to sustain life and even save lives with the proper preservation of its natural habitat. [www.sciences360.com].

But the Quran said this 1400 years ago: (79:32-33) وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَا؛ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ – and has made the mountains firm: [all this] as a means of livelihood for you and your animals. [Asad].

In the word مَتَاعٌ (*Mata'a*) is hidden the entire economic system of the Quran

My dear friends! I remember that I had explained the word مَتَاعٌ (*Mata'a*) earlier. But I will explain it again as this is the last part of the Quran as well as our last round of these lectures: the word مَتَاعٌ (*Mata'a*) contains within it the entire economic system of the Quran: provisions of life; system of nourishment and sustenance – all this can be lumped into this one word مَتَاعٌ (*Mata'a*). The fundamental economic principle of the Quran is: nourishment must be available when it is needed by anyone *and* no one is allowed to hoard beyond one's need. Hoarding makes it illegitimate and wrong. What is needed by others – to hoard it and to not let it freely flow to them renders this illegitimate and false (باطل *Baatil*). The fact is: people are forced to hoard because they are fearful that their future needs may not be met. But, when the economic system of the Quran provides 100% guarantee that نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (6:151) – We who shall provide sustenance for you as well as for your children [Asad] – then there is no need for hoarding.

My dear friends! The travelers those days in the Arabian deserts only carried what they needed: a rope and a bucket to draw water from well; a cane for their defense; some date sand grounded date-stones for food; some parched sheep leather; some clothes to cover their heads – these were all they used to carry and were the essential items for their journeys. They used to carry only one item of each – they didn't carry two ropes or two buckets for example. They will not keep anything that was not *needed*. These essential things to nourish and sustain life are called مَتَاعٌ (*Mata'a*) in Arabic. In this one word the entire economic system of the Quran is contained. So, whatever the Earth produces – the water, the food of all kinds etc. are therefore مَتَاعٌ (*Mata'a*) for life's journey on Earth which serves only as our temporary stay: فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ إِلٰى حِيْنٍ (2:36) – and on earth you

shall have your abode and your livelihood for a while. [Asad]. Life is thus continuous journey and only a temporary abode on Earth according to the Quran. This is not a place for staying forever but it does provide the necessary wherewithal for our journey so that we can keep moving forward. When this journey ends here on Earth and enters the next phase then everything that was essential materially on this journey is left behind. The Quran has used the term مَتَاعٌ (*Mata'a*) for all types of means required for life's journey on Earth. Although there are hundreds of other words for this but the one the Almighty chose – who is all knowing and all wise – is this word مَتَاعٌ (*Mata'a*) because Allah knows that this *is* the word that has the meaning to represent *His* economic system. Human life in this world is a sojourn; and since human life does not end with death but moves forward, death is nothing but taking some rest in the life's Eternal journey. How beautifully Allama Iqbal puts it:

This world is for nourishment of life's trials and episode;

This is not for pleasure nor for sightseeing nor for abode!

This is life and this is its carry-on baggage: مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (79:33) – this is means of livelihood for you and your animals. [Asad].And this is being addressed to entire humankind – this مَتَاعٌ (*Mata'a*) is for everyone: "كُمْ" means for everyone; not that some will have their fill and others will go hungry. Also, this will not just be for humans but for animals as well.

My dear friends! This is the economic system of Islam. This is the economic system of the Quran. There are only four words in this verse but they provide the entire economic system of the Quran! Now you see how deep the relationship is of Earth and its mountains, and of water and its entire cycle; and why the Quran is emphasizing this? One thing is to teach purely for the sake of gaining knowledge like we do in colleges and universities. But the Quran is a book not just to provide knowledge but also it does it in way that brings forth certain principles of life. For example, let us take the verse under discussion (79:33): the Earth is producer of nourishment and sustenance for you as well as your animals – that is open to all

(life) on the planet.Therefore, if it is not open to *all* humankind in any way, shape, or form then it becomes a system of کفر (*Kufr*) not a system of Islam. It is obvious that in a باطل (*Baatil*: false, unjust) system there are rich and poor people; and humans are classified into upper class, middle class, or lower class people. And then there are some whose dogs and cats have better food than some children. There are some with marble mansions and others with no roof on their heads. These differences between humans and humans disappear in the Quranic system which includes every human being equally in its "کُم"(*Kum*).

The Quran wants to create revolution and it gives a beautiful metaphor for it. It started this chapter with *Al-Naziat*(النّٰزِعٰتِ) –people who have been suppressed and drowned but the Quranic revolution was going to level things up. Please note how the Quran uses this metaphor of water to level all the class differences in society in the next verse: فَاِذَا جَآئَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (79:34) – Therefore, when there comes the great, overwhelming (Event) [Yusuf Ali]الطَّآمَّةُ :– The great (Al-*Kubra* الْكُبْرٰى) flood then will level everything in its path. How beautiful is this metaphor! Flood water levels things up: First it fills all the holes and the ditches in its path before it moves further.

The economic revolution of the Quran *is* message of death for class system

The distribution of sustenance should be such that it should first reach those who are in most need. Then it should continue accordingly. The word "مَاعُونَ" describes this flowing river. If the water does not flow then it becomes stagnant. Also, flowing water levels everything – be they pits or peaks. The Quranic revolution would produce such a flood that will level the pits of slavery as well as the arrogant peaks of elites. It will break the chains of slavery as well as the jaws of arrogance and power of elites. It will create complete balance in society. There will be no upper class, middle class, or low class distinctions among human beings. The great Quranic revolution – الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى (Great Event-flood) – will make sure of that. What kind of society would that be? The condition there would

be such that: يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (79:35) – The day when man will call to mind his (whole) endeavor [Pickthall]. And: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (53:39) – and that naught shall be accounted unto man but what he is striving for [Asad]. The return will be only on the effort spent, not on the capital. This is the foundation of the economic system of the Quran and it will take care of those unable to work or handicapped. Those who are able to work and don't – for them there will be no share in this system.

What would be the form of the return on the effort invested?

My dear friends! In this economic system the return is only on the effort invested and not on the capital. In a capitalist system the return is on the capital not on the effort spent. But the verse (79:35) is very clear and explicit that people *will* see the return coming to them for all their effort spent. Actually, it should not be even called return because it is determined by others. For example, employees' wages are determined by employers. But employees are the ones who produce the output. Accordingly, the employees are entitled to their share in the output. This *will* be the case in the revolution brought about by the Quran by dismantling the capitalistic system. The Quran gives another example to illustrate its principle of ownership. Moses (PBUH) was told to confront Pharaoh because he had become a great tyrant and transgress or. He proclaimed himself: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) – I am your Lord the Highest. So, Allah told Moses that you are being selected for an important mission: اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (20:15) – Behold, although I have willed to keep it hidden, the Last Hour is bound to come, so that every human being may be recompensed in accordance with what he strove for in life [Asad]. The revolution was coming but it was, what we call, underground and imperceptible. What a style the Quran has! Whatever types of revolutions are created, whatever kinds of preparations are made – unless there is change in mindset of people there won't be any change in the outside world. Thus an imperceptible revolution has to occur first which focuses on changing minds and hearts of people for the Quranic values as guiding principles of life. The Quran says that the revolution which was going on in the minds and hearts of people and

was imperceptible will now become perceptible. The question is: what was the goal of that Quranic revolution?

The goal of the confrontation of Moses with Pharaoh

My dear friends! First: the goal of Moses was not to become powerful by grabbing Pharaoh's power. The goal was: لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى – so that every human being may be recompensed in accordance with what he strove for in life [Asad]. This is the meaning of this great revolution by a great Prophet (PBUH)! This was the goal of the Quranic revolution. This was indeed a great revolution in history. This was: يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى (79:35) – The day when man will call to mind his (whole) endeavor [Pickthall]. Pharaoh was so arrogant and such a transgressor that he used to proclaim himself: اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (79:24) – I am your Lord the Highest. This revolution brought him down and leveled things up so that no one could exploit anyone else; and that everyone could see the full return of what one had spent effort for; that the result of one's effort will not be taken away by anyone else; that one's harvest could not be grabbed by someone else. Now that the distribution of sustenance will be based on effort spent and not on capital, what would happen to capitalists then in this Quranic system?

Sign of Hell for nations

My dear friends! The Quran says: وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) – And Hell-Fire shall be placed in full view for (all) to see [Yusuf Ali]. We have seen this verse many times before. The Quran says about Hell: it is not far away from you - وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ بِالْكٰفِرِيْنَ (29:54) – verily, Hell is bound to encompass all who deny the truth [Asad]. As a matter of fact, Hell is seeing you even now but only you are not seeing it (79:36). But when that Quranic revolution occurs you will start seeing it. It is hidden from view now but it will become obvious then – this is the meaning of بُرِّزَتِ (*Burrizat*). It will become obvious but not for everyone; only for those who have opened their eyes — لِمَنْ يَّرٰى (79:36). According to the Quran the concept of hell and heaven is quite different than our traditional concept.

Let him see your luster; the one with eyes!

What can one see if one shuts one's eyes?

My dear friends! This is لِمَنْ يَّرٰى (79:36). This is for one whose eyes can see. We have already discussed the meaning of جحیم (*Jaheem*): to get stuck; to have no movement. This is hell. This is death. Life is nothing but having passion for journey. This is to remain in continuous non-stop motion. Once the movement stops, it is death. So, a nation remains forever in hell that does not move forward; that remains stuck at one place.

My dear friends! Where the standard is to follow ancestors; where it is to tread in their footsteps – then the result is obvious. Nations have moved ahead and have reached the moon. But our moon-sighting committee sits in a room trying to decide whether or not the moon has been sighted. They try to get messages through telephone. Controversies abound and debates occur whether or not local people should decide matter on their own or should they rely on moon-sighting news from other places.

My dear friends! When nations abandon thinking this is what happens. Otherwise it is not a difficult subject of Philosophy that requires Aristotle's mind. If you are sitting in Lahore and moon has been sighted here then go ahead declare it. This is not my field of specialization but what prevents you from using technology. But in any matter with Muslims, there is always a sectarian angle at play. Every sect has its own books of hadiths and Sunnah that it quotes from. What I am saying is this: when a people stop thinking the result is stagnation of mind. And what becomes the authority for deciding any issue as a consequence? Ancestral practice: that such and such Imam in such and such book has already pronounced the decision! Such people get stuck and stand at one place and do not move ahead. This is جحیم (*Jaheem*). This is hell (جہنم *Jahannam*).But it is only visible to those who have the vision for it. The Quran is in Arabic; all our scholars' mother tongue is Arabic – then why is that they cannot see this جحیم (*Jaheem*); why is that this hell (جہنم) *Jahannam* that surrounds us and has engulfed us from all sides – but we

cannot see?وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَى (79:36) – And Hell-Fire shall be placed in full view for (all) to see [Yusuf Ali].But only those who have eyesight – the mind's eyesight – would be able to see it.

My dear friends! I will repeat this again as life is short that every word of the Quran holds us and says: stop and think; and don't move until you have understood my meaning!

Where is Hell situated?

The verse (79:36) says about Hell: it is a place of getting stuck orجحیم (*Jaheem*).How would it reveal itself? The general concept is that it will be a fiery place with huge flames erupting from it. Please look at this very important verse of which a major part is normally kept hidden by our religious scholars. The results of human actions get imprinted on their self. They cannot see right now but these results will come out that day about which in verse (79:36) it is said "وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ" (*Burrizatil Jaheem*). But here, in verse (39:48) the Quran says: وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (39:48) – and obvious to them will have become the evil that they had wrought in life: and thus shall they be overwhelmed by the very truth which they were wont to deride [Asad]. This is thejجحیم (*Jaheem*) – this is the imbalance they had caused through their actions. The ill patterns that were imprinted on their self due to their wrong actions and they could not see them – they will reveal themselves now. This is then the revelation of that جحیم (*Jaheem*) that was invisible before but now it is in full view for everyone to see: وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَى (79:36) – And Hell-Fire shall be placed in full view for (all) to see [Yusuf Ali].

The next few verses are: فَأَمَّا مَن طَغَى ; وَآثَرَ الْحَيَوةَ الدُّنْيَا ; فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَى (79:37-39) – For, unto him who shall have transgressed the bounds of what is right, and preferred the life of this world (to the good of his soul),that blazing fire will truly be the goal![Asad]. The word "طَغَى" means crossing the bound established by the Quran; and he crossed this limit and gave preference to immediate benefits

compared to his long-term interests. What is the meaning of transgression of the laws of Allah? It is:وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (79:38) – he gives preference to material interests of this life over the life of the future. Thus according to the Quran, life of this world is not something to be shunned about or to be hated – but to be kept at its own level without transgressing the laws of Allah. For example: getting a chance of making a huge but illegitimate profit but not being tempted by it. The clash between Truth (*Haq*حق) and Falsehood (*Baatil*باطل) is a non-stop continuous process but the real test is which one he gives priority: وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (79:38) – he gives preference of material interests over permanent values of Allah. This is the reason he is in جحیم (*Jaheem*). This is a place where development stops. This is a place where movement stops. And this is the result of "طغٰی" – crossing the bound established by the Quran. As opposed to this: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ; فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (79:40-41) – But unto him who shall have stood in fear of his Sustainer's Presence, and held back his inner self from base desires, paradise will truly be the goal![Asad].Being sure of accountability and being sure that one day one will be standing in the court of Allah – this is what prevents one from committing crime. This is the meaning of: مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ.

The Quranic meaning of هَوٰی (*Hawaa*)

My dear friends! One who keeps in mind that he has to stand in the court of Allah and would have to face accountability – what does he do? – وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى – He holds back his inner self from base desires; he abstains from anything that is against the limits set by the laws of Allah. The word "هَوٰی" is a strange word! The Quran says: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ;ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:4-5) – Verily, We create man in the best conformation; and thereafter We reduce him to the lowest of low [Asad]. That is, instead of reaching higher and higher by following the laws of Allah, man, by following his base desires and vile emotions, descends into the lowest of low. The Arabic root meaning of the word "هَوٰی" is something that

takes one down lower and lower like the stone that is released from the top of a hill. And by its own momentum it keeps going down and keeps gathering speed as it descends lower and lower. This is "هَوٰی" (*Hawaa*). The Quran says: Who saves himself from this "هَوٰی" (*Hawaa*)? Well! It is he who restrains himself from the things that could take him down this hill of base desires. What to say of this – وَنَهَى النَّفْسَ – my dear friends!

Question: what one gains from following permanent values (i.e., the laws of Allah) and from restraining oneself from things that take one downhill to the lowest of low? The Quran says that by following these values life evolves to higher and higher levels; that humans reach greater and greater heights on the pillar of humanity. And by abandoning these values humans descend to lower and lower levels – at individual, societal, as well as at the level of humanity.

Importance and the greatness of Arabic language

My dear friends! I wish I had time to go deeper into the meaning of Arabic words. The meaning of نَهَى (*Nahi*) is of course to restrain and stop oneself. But I feel rapturous when I think how these illiterate Bedouin people created this highly precise language living in a period legendarily known as the period of *Jaahiliyya* or the period of darkness. No previous prophet had come to them and thus they were devoid of any divine revelation. Thus in the absence of any divine revelation what could prevent them from wrong things? What a word عقل (*'Aql*) they had constructed which means to stop humans from inside. The root meaning of عقل (*'Aql*) is: to stop something. The rope with which the Arab Bedouins tie the camel's feet so that the camel cannot move is called "عقال" "*Aqqaal*". The rope with which the Arabs tie their head-cover so that it does not slide and fall down is also called "عقال" "*Aqqaal*". So, عقل (*'Aql*) means that which stops humans from doing bad things, from treading wrong path. This is also the meaning of نَهَى (*Nahi*). Now the illiterate Arabs gave so much importance to عقل (*'Aql*), but, we are forbidden to use عقل (*'Aql*) in matters of Islam – and those who are labeled deviators (*Mu'tazilaas*). And the result is obvious: ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (95:40) – and thereafter We reduce him to the lowest of low [Asad].

My dear friends! Let us see this verse again: وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (79:40) – he stops his base desires and vile emotion. He holds back his inner self from base desires. Because of this: فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى (79:41) – paradise will truly be the goal! الْجَنَّةَ (*Al-jannah*), i.e., Heaven has come here on Earth for those abiding by the limits set by Allah in contrast to Hell or جحیم (*Jaheem*) which we saw earlier for transgressors of this limit. Then the Quran says: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (79:42) – THEY WILL ASK thee [O Prophet] about the Last Hour: "When will it come to pass?" They are asking thee when that ship will be anchored; and not when that revolution will start because that revolution had started earlier and was going ahead in its silent mode anyway. They are asking: when that ship of revolution that started some time ago will get anchored. Revolutions do not suddenly appear on the scene. They continue to work slowly like the ship moving on the surface of the ocean and when it anchors then we normally call it a revolution although its ship started long time ago. Now they ask: when will that ship anchor? فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (79:43) – [But] how couldst thou tell anything about it? [Asad].They should not be concerned with *when* will that ship anchor, *when* will that revolution transpire?

You remember that at many places in the Quran the Prophet (PBUH) asks: O Allah! All my life has been spent in this struggle to establish your *Deen* but when will my effort bear fruit? Allah's reply to this: وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) – BUT WHETHER We let thee see [in thy lifetime, O Prophet, the fulfilment of] some of what We have promised them, or whether We cause thee to die [before its fulfilment] - thy duty is no more than to deliver the message; and the reckoning is Ours.[Asad]. My dear friends! Even to the Prophet (PBUH) Allah did not tell anything about *when* that revolution and struggle will bear fruit. He tells him to continue to struggle and to continue to convey His message. فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰهَا (79:43) – [But] how couldst thou tell anything about it? Then the Quran says: اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا (79:44) – with thy Sustainer alone rests the beginning and the end (of all knowledge) thereof?[Asad].Here, the word "مُنْتَهٰهَا" has come. The root of this word is the same as of the word نَهٰى (*Nahi*). So, when the result will come out; when the ship of revolution will anchor; when will it stop? – Well, its knowledge rests with Allah. But when it happens; when the revolution appears – everyone will see. But no one can know this before it appears.

Posters about قیامت (Qiyamat) – End of the world

My dear friends! It was a common practice during my childhood that posters about قیامت (Qiyamat), i.e., the end of the world, were posted everywhere. But this practice has been discontinued now. Maybe they got tired of it. But the Quran says that its knowledge is only with Allah: إِلَىٰ رَبِّكَ مُنتَهَاهَا (79:44) – with thy Sustainer alone rests the beginning and the end (of all knowledge) thereof. And Allah told the Prophet (PBUH): إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرُ مَن يَخْشَاهَا (79:45) – Thou art but (sent) to warn those who stand in awe of it [Asad]. This is same thing as: فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (13:40) – thy duty is no more than to deliver the message; and the reckoning is Ours [Asad]. Therefore, the same thing applies to everyone of us:If we start asking Allah when our efforts will bear fruit? Our job is to carry on with conveying His message and not to be impatient about seeing the result. كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا (79:46) – On the Day when they behold it, (it will seem to them) as if they had tarried (in this world) no longer than one evening or (one night, ending with) its morn![Asad].When that moment actually comes which they were asking about, they will feel as if it came too soon – maybe after just a morning or an evening. These people were so impatient to know when that event will come. But when it does finally come it will seem to them as if their entire life was a morning or an evening; no more than that. They will lose all their senses and become completely befuddled. They will lose their memory about how long they had lived; what they had done; and what they had left behind? The Quran says that the revolution would be so intense that they will be under the influence of shock-and-awe. O Prophet (PBUH)! Tell them why are you pleading for its arrival? Why are you impatient to see this impending revolution? Is it the sighting of the new moon of the celebration of Eid that you want it to be hastened? Because when it does come it will not be the new moon of Eid but a moment for your destruction. At that time you will start crying – only if we could get some more time we would change our ways! But what will you gain by being sorry or remorseful at that time? Nothing?

My dear friends! Surah *Al-Naziat* (النَّازِعَاتِ)has ended today. We will take up Surah *'Abasa*(عَبَسَ) in our next lecture (80:1).

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.68
ISSUE
6

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idara@toluislam.com
web:www.toluislam.com

ان سے کہو کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں
کہ اللہ نے میری وساطت سے تمہاری طرف
اس قسم کا ضابطۂ زندگی بھیجا ہے۔
جو لوگ اس کی صداقتوں پر ایمان لائیں گے
ان کے لیے اس میں سامانِ رحمت و ربوبیت ہوگا اور
شاہراہِ حیات کے ہر موڑ پر اس امر کی یاد دہانی
کہ انہیں کس طرف جانا چاہیے۔ (29-51)